فکرِ اقبال کا ترجمان

میرا پیام

(۱۳)

مدیر
پروفیسر عبدالحق
وائس چیئرمین
اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

اقبال اکیڈمی (ہند) نئی دہلی

جملہ حقوق محفوظ

ناشر : اقبال اکیڈمی (ہند)، نئی دہلی
اشاعت : جنوری، ۲۰۲۱ء
پریس : اصیلا پریس نئی دہلی
قیمت : سو روپے

MERA PAYAM

Iqbal Academy (India)
Cisrs House, 14 Jangpura B.
Mathura Road, New Delhi
January, 2021

ترتیب

حرفِ آغاز	ڈاکٹر سید ظفر محمود	4
عرضِ حال	پروفیسر عبدالحق	5
پروفیسر عبدالرحیم	مطالعۂ اقبال کے نئے گوشے	7
پروفیسر عبدالحق	حدیثِ رسولؐ اور شعرِ اقبال	14
پروفیسر توقیر احمد خاں	اقبال کی نظم کفر و اسلام کا تجزیہ اور مومن صفات	24
پروفیسر علی احمد فاطمی	اقبال اور جوش	29
ڈاکٹر محمد عامر اقبال صدیقی	بھارت میں اقبال شناسی	52
ڈاکٹر محمد نفیس حسن	اقبال اور خطاب بہ جوانانِ اسلام	72
ڈاکٹر صدف نقوی	تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ	78
ڈاکٹر عامر محمود	غالب اور غالبیات -- ایک تجزیاتی مطالعہ	80
ڈاکٹر سرفراز جاوید	اقبال کا قصۂ آدم	89

حرفِ آغاز

قید و بند کی اس آزمایش میں رسالے کی اشاعت کا جاری رکھنا آسان نہیں۔ ربِّ کریم کا ہزار شکر ہے کہ اس نے اشاعت کی توفیق بخشی۔ قدرے تاخیر ہوئی۔ اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ دوستوں کی فرمایش اور یاد آوری کے لیے شکر گزار ہوں کہ وہ تیرہویں شمارے کا متواتر مطالبہ کرتے رہے۔ ان کے جذبۂ شوق نے مجھے متاثر کیا اور ''میرا پیام'' کی مقبولیت کا احساس دلایا۔

رسالہ اکیڈمی کی سرگرمیوں کا سنگِ نشاں ہے عزیز و احباب کا ایک حلقہ اس سے وابستہ ہے۔ ان کی خواہشات کا استقبال میرا اولین فرض ہے بلکہ ادارہ ایسے مخلصین کے لیے وقف ہے۔ اقبال کو چاہنے والوں کا حلقہ اب ایک آفاقی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ ۹ر نومبر کو یومِ اقبال کی تقریبات نے خطۂ زمین کے بیشتر بڑے حصے کو متوجہ کیا ہے۔ یہ سعادت اقبال کو حاصل ہے۔ اقبال کی نسبت سے یہ ادارہ بھی سرخرو ہے۔

ڈاکٹر سید ظفر محمود

عرضِ حال

فکرِ اقبال کا یہ لافانی نکتہ پیشِ نظر رکھیے کہ زندگی ایک مسلسل اور آگے کی طرف رواں دواں عمل کا نام ہے۔ کائنات کی ہر شے اسی عمل پر گامزن ہے۔ کسی بھی مقام پر ٹھہر جانا ہلاکت کا سبب ہے جو ٹھہرے وہ کچل گئے ہیں۔ کارواں میں سنگِ نشاں بھی ریگِ رواں کا ہم دوش ہے۔ یہی حقیقتِ ابدی ہے۔ اس بلاخیز بیماری کے آشوب میں بھی زندگی کا سفر جاری ہے۔ وقفہ ضرور آیا مگر تدبیر سازی کا کام ہوتا رہا۔ رسالے کی اشاعت میں وسائل کے تعطل سے تاخیر ہوئی۔ قلم کاروں سے درخواست یا اصرار کرنے میں تامل حائل رہا۔ آمد و رفت کے سلسلے بھی موقوف تھے۔ ان دشواریوں کے ساتھ جریدے کی اشاعت فضلِ ربّی ہے۔ شائقین کے فون پر اتنے تقاضے کبھی نہیں سنے اور نہ کبھی اتنا شرمسار ہوا۔ رب کا شکر ادا کرتا ہوں کہ ربِّ جلیل نے اشاعت کے اسباب پیدا کیے۔ امید ہے کہ عنقریب میرا پیام دوستوں کے درمیان موجود ہوگا۔ اور شناسایانِ اقبال کو ایک گونہ مسرت ہوگی۔ تیرہواں شمارہ بھی حسبِ معمول پسند کیا جائے گا۔ تاخیر اور خامیوں کو درگزر کرنے کی درخواست ہے۔ دوستوں سے حاصل کردہ مضامین قارئین کی خدمت میں حاضر ہیں۔ بیش و کم کا معاملہ ان کے استصواب پر ہے۔ پروفیسر عبدالرحیم قدوائی، پروفیسر علی احمد فاطمی، پروفیسر توقیر احمد خاں، پروفیسر محمد آصف اعوان فیصل آباد، ڈاکٹر محمد عامر اقبال صدیقی سیال کوٹ، ڈاکٹر صدف نقوی، ڈاکٹر نفیس حسن کی نوازشات کے لیے ممنون کرم ہوں کہ انہوں نے رسالے کی توقیر و توقیع میں اضافہ کیا ہے۔

پروفیسر محمد آصف اعوان نے بڑی دیدہ وری سے اقبال کی سب سے مشہور کتاب ''تشکیل جدید الٰہیاتِ اسلامیہ'' کا ترجمہ کیا ہے۔ تشکیل کا اردو میں یہ چھٹا ترجمہ ہے۔ فکرِ اقبال کا استعجاب دیکھیے کہ ان کی کتاب کا ایک ہی زبان میں چھٹواں ترجمہ مکمل ہوگیا ہے۔ فکرِ اقبال کی یہ اعجاز نمائی ہے۔ اس ترجمہ پر لکھے گئے ڈاکٹر صدف نقوی کے دیباچے کو رسالے میں شامل کیا گیا ہے۔ ناچیز ان کا شکرگزار ہے۔

عبدالحق

پروفیسر عبدالرحیم قدوائی
مسلم یونیورسٹی

مطالعہ اقبال کے نئے گوشے

ہمارے اردو کے ممتاز ترین ماہر اقبالیات پروفیسر عبدالحق کی یہ تحقیق ہے کہ اردو میں تمام اہل قلم میں سب سے زیادہ تصانیف اب تک اقبال پر شائع ہوئی ہیں۔ اور یہ سلسلہ دراز ہے۔ مغرب کی علمی دنیا میں مصنفین کے حوالوں (Cutations) کا رواج عام اور ان حوالوں کا باضابطہ حساب کتاب رکھا جاتا ہے۔ ان اعداد وشمار کی رو سے مغرب/انگریزی زبان سے ارسطو، افلاطون اور شیکسپیر جیسے نابغۂ روزگار کے حوالے علی الترتیب سب سے زیادہ عام ہیں۔ اگر اردو میں یہی نظم قائم کیا جائے تو سب سے زیادہ مطبوعات ہی کی طرح سب سے زیادہ حوالوں کا شرف بھی اقبال ہی کو حاصل ہوگا کہ ان کا کلام ہماری علمی ادبی اور ملی تاریخ کا جزو لاینفک ہے۔

مغرب میں مطالعۂ اقبال کی انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں روایت ایک صدی سے زیادہ قدیم ہے اہم ترین نکتہ یہ ہے کہ یہ علمی روایت توانا بھی ہے اور مسلسل بھی۔ راقم الحروف کی تصنیف جلوۂ دانشِ فرنگ کی کتابیات میں کلام اقبال کے مغربی زبانوں میں تراجم اور اقبال کے فکروفن پر تحقیقی اور تنقیدی کتب اور مقالات کے کوائف درج ہیں۔ صرف انگریزی زبان میں اہل مغرب کی تصانیف کی تعداد تقریباً تین سو ہے۔ (۱) مغربی فضلاء کی مرتب کردہ ایک وقیع کتابیات کی رو سے تمام مغربی زبانوں میں اقبال کی عظمت کے اعتراف کے طور پر ۲۰۰۰ء تک ڈھائی ہزار (۲۵۰۰) سے زائد کتابیں، مقالے اور کلام اقبال کے تراجم منظر عام پر آچکے ہیں۔ (۲)

زیر نظر مضمون میں اقبال پر دیارِ مغرب میں شائع گران قدر مطبوعات کے اس خوش کن سلسلے کی ایک فکر انگیز انگریزی تصنیف کا تعارف پیش ہے۔ اصلاً یہ نو (۹) عالمانہ مقالوں پر مشتمل مجموعۂ مضامین اس عنوان سے ہے Muhammad Iqbal Essays on the Reconstuction of Modern Muslim Thoughy (محمد اقبال: جدید مسلم فکر کی تشکیل نو) اس کے مرتبین ولفرڈ لاریر Wilfrid Laurier یونیورسٹی کے استاد پروفیسر ایچ۔ آئی ہلیز Hiliiar اور لاہور مینجمیٹ یونیورسٹی، پاکستان کے استاد پروفیسر باسط بلا کوشل ہیں۔

اس مجموعے میں شامل نو (۹) مقالات یہ ہیں۔

۱۔ تعارف از رفعت حسن لوئی ول یونیورسٹی، امریکہ
۲۔ فکر اقبال میں تصور خودی: از ابراہیم موسیٰ نوثرے دیم یونیورسٹی، امریکہ
۳۔ ہندی برگساں اور اقبال کے مابین نقطۂ اتصال: از سلیمان باقر ڈاگنے، کولمبیا یونیورسٹی، امریکہ
۴۔ دور حاضر میں اقبال کی معنویت: از باسط بلال کوشل، لاہور مینجمینٹ یونیورسٹی، پاکستان
۵۔ پیٹرسن اور اقبال کی فکر میں عملیت پسندی اور اسلام: مابعد الطبیعات کا ارتقاء
از رچرڈ گلمور، کنکارڈ پا کالج، امریکہ
۶۔ فکر اقبال میں ہیگل، رومی اور اسلامی فلسفیانہ روایت کا مقام: از سجاد رضوی ایکزیٹر یونیورسٹی، انگلستان
۷۔ مابعد الطبیعاتی عہد کے بعد کے دور میں اسلام کی تشریح نو: فکر اقبال میں ابدیت کا تصور
از کرسٹوفر اسکاٹ میکلور، ہارورڈ یونیورسٹی، امریکہ
۸۔ اقبال اور برگسان کے ہاں ابہیات اور سیاسی فکر کی تشکیلِ نو: از ایچ۔سی۔ہیلیر، ولفرڈ لاریر یونیورسٹی، کناڈا
۹۔ شاعری، فلسفے اور مذہبی اور سیاسی عمل کے ذریعے مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ کی بحالی کے لیے اقبال کی جہد و جہد
آر۔ڈین۔ای نکس، ینول وار کالج امریکہ

یہ مجموعہ مقالات انگلستان کے مقتدر اشاعتی ادارے یونیورسٹی پریس نے ۲۰۱۵ء میں شائع کیا ہے۔اس تصنیف کا آغاز پروفیسر رفعت حسن کے عالمانہ مقدمے سے ہوا ہے۔ یہ پاکستان نژاد فاضلہ تانیثی تحریک، اسلام اور اقبال پر اپنی وقیع تصانیف کے لیے معروف ہیں اور عرصے سے امریکہ میں درس وتدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔اس ''مقدمے'' کے کلیدی نکات ذیل میں مختصراً مذکور ہیں:

اپنی پیش بینی، وسعتِ علم اور قوتِ آخذہ کے لحاظ سے اقبال بے مثال ہیں۔وہ علی گڑھ تحریک کے آخری لیکن ممتاز ترین مفکر ہیں۔اس تحریک کی بدولت مسلمانانِ ہند کے شعور بلکہ تصورِ جہاں میں ایک انقلابی، بنیادی تبدیلی واقع ہوئی جس نے ان کے مستقبل اور تقدیر کی قلب مائیت ہی کر دی۔ میری دانست میں وہ اپنے مرشد مولانا جلال الدین رومی (۱۲۷۳۔۱۲۰۷) کے بعد عالم اسلام کے عظیم ترین فلسفی، شاعر ہوئے ہیں۔ان کے امتیازات گوناگوں ہیں۔وہ غیر معمولی صلاحیتوں کے حامل شاعر اور مفکر تھے۔ بظاہر کسی شخص کا بیک وقت شاعر و فلسفی ہونا قولِ محال سا محسوس ہوتا ہے کیونکہ شاعری کا سروکار بیش از بیش علائم اور رموز سے ہوتا ہے۔اس میں مقدمات صغریٰ و کبریٰ کا گزر نہیں۔اس کے برعکس فلسفے کا دارومدار ہی متعین اور منضبط افکار، تصورات اور زمروں پر ہوتا ہے جس میں ابہام کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اس لحاظ سے اقبال کے ہاں شاعری اور فلسفے کا امتزاج ایک نادرالوقوع کارنامہ ہے۔

اقبال اس اعتبار سے بھی منفرد ہیں کہ تاریخ عالم میں اب تک کوئی ایسا شاعر یا فلسفی منصۂ شہود پر نمودار نہیں ہوا ہے جس نے اپنے پیغام سے لاکھوں افراد کو متاثر اور متحرک کر دیا ہو۔ اقبال نے ایسے لاکھوں مسلمانانِ ہند کو فعال بنا دیا جو ۱۸۵۷ء میں اپنی سلطنت کے سقوط کے بعد مفلوج بلکہ نیم مردہ ہو چکے تھے۔ انہوں نے ایسے مایوس افراد کو زندہ رہنے بلکہ اپنے خوابوں کو عملی جامہ پہنانے کا حوصلہ اور عزم دیا اور ان کے حیات آفریں پیغام کے زیر اثر وہ اپنے حقوق اور انصاف کی بازیابی کے لیے میدانِ عمل میں صفِ آراء ہو گئے۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند کو ایک متعین مقصدِ حیات سے روشناس کیا۔ ان کے پیغام اور کلام کی نشاۃ کلید قرآن مجید ہے جس میں تمام تر اہمیت عمل کی ہے اور افکار اور تصورات کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے۔ اپنے مضمون میں برطانوی شاعر اور نقاد ہربرٹ ریڈ (Herbert Read) نے اقبال کے اسی امتیاز کا ذکر استحسان کے ساتھ کیا ہے کہ ان کے ہاں فعالیت کا مقام مرکزی ہے۔

ہر چند کہ اقبال کے پیغام کے زیر اثر مسلمانانِ ہند استعماری برطانوی حکومت اور اکثریتی فرقے سے نجات کے لیے برسر پیکار ہوئے، اقبال کا پیغام عمل کسی مخصوص زماں و مکاں کا پابند نہیں ہے۔ ان کا فلسفۂ حیات مسلمانانِ ہند و پاک ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام کے لیے بامعنی اور کارگر ہے۔

اقبال کی ''اسرارِ خودی'' بلکہ ان کے کل کلام کا مقصود خواب غفلت سے بیداری تمام غیر قرآنی عناصر سے تطہیر اور مکمل اجتناب اور باطل کی ہر شکل کے خلاف نبرد آزمائی ہے۔ اقبال کے کلام کے برطانوی انگریزی مترجم پروفیسر آر۔ اے نکلسن نے اقبال کو صرف اپنے عہد ہی نہیں بلکہ مستقبل کا بھی راہ بین قرار دیا ہے۔ امریکی فلسفی رابرٹ وہٹمور (Whitemore) کے مطابق اقبال کا تصور جہاں سراسر اسلامی ہے۔ البتہ یہ صراحت بھی ضروری ہے کہ ان کے ہاں اسلام محض چند عقائد اور رسوم و رواج کے مجموعے کا نام نہیں بلکہ یہ ایک مکمل، جرکی اور آفاقی نظریۂ حیات ہے۔ اسلام ان کو اس لیے عزیز ہے کہ اس میں رنگ، نسل، قوم کی بنیاد پر کوئی امتیاز نہیں برتا جاتا اور یہ مکمل مساوات، عدل اجتماعی اور انصاف کا علمبردار ہے۔ اس پر مزید یہ ہے کہ اس میں دین اور دنیا کی کوئی تفریق نہیں۔ اسلام انسان کی آرزوؤں کا منتہا ہے۔ رفعت حسن کے تجزیے کی رو سے اقبال کی عظمت ان کے مؤثر آفاقی پیغام کی بدولت ہے۔

اپنے مقالے ''فکرِ اقبال میں تصورِ خودی'' میں ابراہیم موسیٰ نے فلسفۂ خودی کے عمرانیاتی پہلو پر محاکمہ پیش کیا ہے۔ اقبال کا تصور خودی تاریخِ فلسفہ میں بیش بہا اضافہ ہے۔ اس تصور کو بطور محرک بروئے کار لاتے ہوئے انہوں نے امت مسلمہ کی معاشرتی تجدید اور تشکیل نو کا کارنامہ انجام دیا۔ ان کا تصورِ خودی انانیت اور خودغرضی سے پاک ہے اور وجدان کے مابعد الطبیعاتی پہلو میں پیوست ہے۔ یہ ایک ایسا

مثبت اور حیات آفریں اشاریہ ہے جو انسان کو تشخص عطا کرتا اور تخلیقی انقلاب کے لیے متحرک کرتا ہے۔

اپنے مقالے ''ہندی برگساں اور اقبال کے مابین نقطۂ اتصال'' میں سلیمان باقر ڈاکٹر نے ان دونوں مفکرین کے ہاں اہم مشترک فلسفیانہ افکار اور اقدار کی نشاندہی کی ہے۔ دونوں کے ہاں خود کا تصور کلیدی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تصور شخصیت کے بارے میں تجربی اور عقل پرستانہ نظریے کو مسمار کرتا ہے کہ اس میں کائنات سے متعلق محض حواس خمسہ پر مبنی لخت لخت تجربوں پر انحصار نہیں بلکہ حقیقت عظمیٰ کے وجدانی تجربے سے انسان سرشار اور شاد کام ہوتا ہے۔ اقبال یونانی ضمنیات سے ماخوذ علم کائنات کو مطلق قابل اعتنا نہیں گردانتے۔ ان کی دانست میں اس وسیع اور عریض کائنات میں ہر آن عملِ تخلق جلوہ گر ہے جو کہ منفرد بھی ہے اور ابتکاری بھی۔ برگساں اور اقبال دونوں اس نکتے پر متفق ہیں کہ علم کائنات کا تصور معاشرے پر اثر انداز ہوتا ہے اور اسے جہانِ نو کی جانب رواں دواں رکھتا ہے۔

اپنے مقالے ''محمد اقبال کی دورِ حاضر میں معنویت'' میں باسط بلال کوشل نے عصر حاضر میں فکرِ اقبال کے جواز پر اظہار خیال کیا ہے۔ فلسفۂ اقبال مذہب اور سائنس کے مابین بُعد کو پُر کرتا ہے کہ ان کے ہاں ان دونوں کے درمیان نسبت کسی مناقشے یا مجادلے پر نہیں بلکہ مکالمے پر قائم ہے۔ جدید سائنسی تحقیقات کی حکمتِ قرآنی سے تطبیق کرتے ہوئے انہوں نے کائناتی، وجودیاتی اور غایاتیاتی دلائل کی بنیاد پر وجودِ خداوندی کا اثبات کیا ہے۔

اپنے مقالے ''پیئرس اور اقبال کے افکار میں عملیت پسندی اور اسلام کا مقام: مابعد الطبیعات کا ارتقاء'' میں رچرڈ گلمور نے ان دونوں مفکرین یعنی امریکی فلسفی اور ریاضی داں چارلس سینڈرس پیئرس (۱۸۳۹)(۱۹۱۴) اور اقبال کے افکار میں مشترک نکات کا احاطہ کیا ہے۔ دونوں مفکرین اس نظریے کے حامل ہیں کہ تمام مابعد الطبیعاتی تبدیلیوں کا منبع انسانی ذہن ہے۔ پیئرس کے تصور عملیت پسندی اور اقبال کی تفہیم اسلام میں یہ نکتہ متفق علیہ ہے کہ اعمال اور عقائد پر محاکمہ ان کے اثرات پر موقوف ہے۔ اس کی وضاحت کے لیے مقالہ نگار نے پیئرس کے نظریۂ شخصیت اور اقبال کے ہاں عقیدۂ توحید کا موازنہ کیا ہے اس موازنے کی رو سے دونوں مفکرین ان نکات پر بھی متحد الخیال ہیں۔ ماورائیت کا اثبات سائنسی اور میکانکی علم کائنات کی تردید، خودی کا تخلیقی ارتقاء اور کائنات میں ہم آہنگی اور امتزاج کا تصور دونوں مفکرین اس نکتے پر اتفاقِ رائے رکھتے ہیں کہ خدا کی خلاقیت کے باعث کائنات میں توحید اور ہم آہنگی کی صفات نمایاں ہیں اور یہ حقیقت بنی نوعِ انسان کے متحرک ہونے لیے مشعلِ راہ ہونا چاہئے۔

اپنے مقالے ''فکرِ اقبال میں ہیگل، رومی اور اسلامی فلسفیانہ روایت کا مقام'' میں سجاد رضوی نے جنوبی ایشیا کی فکری تاریخ میں اقبال کی حیثیت کا تعین کیا ہے۔ اقبال کا سروکار معاصر مسلم اور مغربی

تصورات دونوں سے رہا۔ مقالہ نگار کی تحقیق کے مطابق فکرِ اقبال کسی مخصوص ملک یا مکتبِ فکر کے تابع نہیں ہے۔ اقبال نے مسلم فکری روایت پر نقد و نظر کا فریضہ انجام دیا اور اسے مغرب کے علمی حلقوں میں متعارف کیا۔ اقبال کے اپنے ذہنی اور فکری ارتقاء کے تین ادوار ہیں: (i) ابتدائی دور ہندوستان میں (ii) وسطی دور یوروپ میں اور (iii) آخری دور پھر ہندوستان میں۔ مقالہ نگار نے ان ادوار کی ممتاز شخصیات اور مؤثر مکاتبِ فکر سے اقبال کا موازنہ کیا ہے۔ اس تجزیے کی رو سے اقبال کلی طور پر نہ مذہبی روایت سے اور نہ جدیدیت سے وابستہ ہیں بلکہ ان کے نظریۂ خودی کے پیشِ نظر ان کو ایک مسلمان وجودی مفکر قرار دیا جاسکتا ہے۔

اپنے مقالے ''مابعد الطبیعاتی عہد کے بعد کے دور میں اسلام کی تشریح نو: فکرِ اقبال میں ابدیت کا تصور'' میں کرسٹوفر اسکاٹ میکلور نے فکرِ اقبال میں ابدیت کے تصور کو متعین کیا ہے اور اس کے معاشرتی اور مذہبی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا ہے۔ مقالہ نگار کے مطالعے کے مطابق اقبال کا تصورِ ابدیت نہایت جدید ہے اور اس کے تعلق مابعد الطبیعات کی بہ نسبت غایاتیات سے زیادہ ہے۔ ابدیت کا امکان دو سطحوں پر ہے۔ ذاتی زندگی میں اور خزینۂ تاریخ میں۔ اقبال کے ہاں ابدیت کا تصور حیات بعد الموت سے منسلک ہے البتہ ابدیت کا نقطۂ آغاز انسان کے اعمال اور افعال ہیں جو کہ معاشرے میں انجام پاتے ہیں۔ ان کی نوعیت سیاسی بھی ہوسکتی ہے۔ انسان کے اعمال کے دوررس اثرات معاشرے اور مذہب دونوں پر مرتب ہوتے ہیں۔ یہ بھی ملحوظ رہے کہ مومن بندے کو اجتہاد کا بھی حق حاصل ہے۔

اپنے مقالے ''برگساں اور اقبال کے ہاں الٰہیات اور سیاسی فکر کی تشکیل نو'' میں ایچ۔ سی۔ ہیلیر نے ان دونوں مفکرین کے تصور الٰہیات اور سیاسی فکر کا مطالعہ کیا ہے۔ جدید مغربی تصور جہاں میں خدا کا کوئی مقام نہیں ہے، بالخصوص سیاسی فکر اور نظام حکومت میں۔ عرصے سے خدا کے مقام اور منصب کے موضوع پر کسی مغربی مفکر نے لب کشائی تک نہیں کی ہے۔ البتہ ہیلیر کی تحقیق کے مطابق برگساں اور اقبال کے مندرجہ ذیل مشترک مابعد الطبیعاتی اور عملیاتی تصورات کے زیر اثر تصور جہان میں خدا کا مقام قدرے بحال ہوا ہے۔ انسانی تجربے کی آفاقیت، حقیقت عظمیٰ کی وحدانیت، وجدان، کائناتی تبدیلیاں، قوتِ حیات اور خودی وغیرہ۔ یہ دونوں معاشرے کی اجتماعی زندگی میں متصوفانہ تجربے کی اہمیت کے قائل ہیں اور دونوں کا یہ عقیدہ ہے کہ سیاسی طبع آزماؤں نے انسان کی عزتِ نفس، آزادی اور فلاح کو جو گزند پہنچائی ہے اس کا مداوا صرف مذہب کرسکتا ہے۔

اپنے مقالے ''محمد اقبال کے ہاں شاعری، فلسفے اور مذہبی اور سیاسی عمل کے ذریعے مسلمانوں کی شوکتِ رفتہ کی بحالی'' میں ڈین۔ ای۔ نکس نے اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ اقبال نے برطانوی دور

استعماریت میں مسلمانانِ ہند کی عزتِ نفس اور عظمتِ رفتہ کو مستحکم کرنے کی سعی کی۔ اقبال نے مسلمانانِ ہند کے ان دو امراض کی تشخیص کی: استعماری قوت کے معاشرتی، سیاسی، فلسفیانہ اور مذہبی نظریات سے ان کا متاثر بلکہ مبہوت ہونا اور مسلمانوں کی ذہنی اور فکری بے عملی اور ان میں عزم اور حوصلہ کا فقدان۔ اقبال کی نظر میں اس کا علاج نظریۂ خودی ہے تاکہ امتِ مسلمہ بیدار ہو اور اپنے استحصال اور استیصال کا پامردی سے مقابلہ کرے۔ نظریۂ خودی کا پرکار بند ہونے کے لیے مسلمانانِ ہند کو اعلیٰ کردار اور اخلاق سے بھی متصف ہونا چاہئے اور یہ قلب ماہیت ان کے اندرون میں واقع ہونا چاہئے۔

مختصراً اس مجموعۂ مقالات میں بیسویں صدی کے جدید فلسفیانہ افکار کے تناظر میں فکرِ اقبال کی اہمیت اور افادیت کا تجزیہ بالغ النظری اور جلالتِ علمی کے ساتھ کیا گیا ہے اور عصر حاضر میں اقبال کی دانش وری اور معنویت کا اعتراف کیا گیا ہے۔ مطالعۂ اقبال کے یہ نئے گوشے مزید تحقیق کے لیے باعثِ ترغیب اور تشویق ہوں گے۔

اس مجموعۂ مقالات سے انگریزی میں اقبال کے فکر وفن پر تازہ ترین مطبوعات کے منظرِ عام پر آنے کا بھی علم ہوتا ہے۔ ذیل میں اکیسویں صدی کی منتخب تصانیف کی تفصیلات شائقین اقبال کے لیے پیش ہیں۔

(1) Diagne, Soulmane Bachin, Islam and Open Society: Fidelity and Movement in the Philosophy of Muhammad Iqbal.

(اسلام اور آزاد معاشرہ فلسفۂ اقبال۔ ڈاکٹر سینیگال، ۲۰۱۹ء)

(2) Masud, Khalid, Iqbal's Reconstruction of Ittihad.

(اقبال کے ہاں اجتہاد کی تعبیر نو۔ لاہور اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۳)

(3) Sevea, Iqbal Singh, The Political Philosophy of Muhammad Iqbal: Islam and Nationalism in the late Colonial India.

(اقبال کے سیاسی افکار: استعماری ہندوستان میں اسلام اور قومیت پرستی۔ کیمبرج یونیورسٹی پریس، ۲۰۱۲ء)

(4) Sharique, Khurram Ali, Iqbal: An Illustrated Biography.

(اقبال: باتصویر سوانح عمری۔ لاہور، اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۷ء)

(5) Afzal Ahmed, " Iqbal's Approach to the Quran".

(اقبال کے مطالعۂ قرآن مجید کا منہج۔ مقالہ بین الاقوامی اقبال مذاکرہ، کمبرج یونیورسٹی۔ ۱۹۔۲۰ جون ۲۰۰۸)

(6) Ochs, Peter, "Iqbal's Peirce and Modernity".

(اقبال مذاکرہ کیمرج یونیورسٹی، انگلستان۔ ۲۰۱۹ء)

(7) Umar, Muhammad Suheyl and Basit Bilal Koshel (Ed.) Muhammad Iqbal: A Contemporary.

(معاصر اقبال۔مجموعۂ مقالات، بین الاقوامی مذاکرہ منعقدہ کیمبرج یونیورسٹی، انگلستان۔۲۰۱۰ء)

(8) Min, Mustansir, Iqbal,

(اقبال، کراچی، آکسفورڈ یونیورسٹی پریس، ۲۰۰۶ء)

(9) Rashid, Salman, Iqbal's Concept of God.

(اقبال کا تصور خدا۔کراچی آکسفورڈ یونیورسٹی پریس۔۲۰۱۰ء)

(10) Ashrif, Ehsan, A Critical Exposition of Iqbal's Philosophy.

(اقبال کے فلسفے کا تجزیاتی مطالعہ۔دہلی آدم پبلشرز، ۲۰۰۳ء)

(11) Beg, A.A., The Poet of the East.

(شاعرِ مشرق لاہور اقبال اکیڈمی، ۲۰۰۴ء)

(12) Nice, Dayne E. Muhammad Iqbal and the Perfect Man: Restoring Muslim Dignity through the Integration of Philosophy, Poetry, Politics and Conservative Islam.

(اقبال اور انسان کامل: مسلمانوں کی عظمت رفتہ کی بحالی فلسفے، شاعری، سیاست اور روایتی اسلام کے امتزاج کے ذریعے پی۔ایچ ڈی مقالہ نیویارک۔میلن یونیورسٹی پریس۔۲۰۱۱ء)

حوالے

عبدالرحیم قدوائی، جلوۂ دانش فرنگ: اقبال کے فکروفن پر انگریزی میں تنقیدی مضامین کے اردو تراجم۔دہلی، اقبال اکیڈمی (ہند)، ۲۰۱۸ء ص۔۱۸۳۔۲۱۶۔

Taillien, Dieter, Francis Laleman and Winand M. Callewaert, Bibliography of Allama Muhammad Iqbal (1877 -1938) Leuven, Belgium, Peeters, 2000

اس کتابیات کے تعارف اور تجزیے کے لیے دیکھیے عبدالرحیم قدوائی، جلوہ دانش فرنگ، ص۔ ۱۷۸۔۱۸۲۔اصلاً یہ مضمون تہذیب الاخلاق، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۳۵:۵ (مئی ۲۰۱۶) ص۔۴۳۔۵۱ میں شائع ہوا تھا۔

پروفیسر عبدالحق

حدیثِ رسولؐ اور شعرا اقبال

سیرتِ سرورِ عالمؐ شعری ثقافت کا سب سے محترم موضوع سخن ہے۔تقریباً ہر سخن ور نے ذکرِ رسالت مآبؐ سے اپنی تخلیق کو پر نور کرنے کی کوشش کی ہے۔بعض شعراء اس نسبت کی برگزیدی سے بلندی پر فائز ہوئے۔ان کی ناموری ناموس نبوت سے قائم ہوئی۔شعری تخلیق کا ایک گراں قدر حصہ ذکر وفکر میں وظیفۂ روز وشب ٹھہرا۔شعرا کے جذب وشوق کا اظہار قاری کو عرفان وآگہی کے سوز وساز سے سرشار کرنے کا باعث بنا۔فن میں عشق وعقیدت کی یہ وارفتگی اور فراوانی کسی اور شخص سے وابستہ نظر نہیں آتی۔ہماری ادبی ثقافت کا یہ امتیاز بھی ہے۔ذات گرامیؐ کا تخلیقی محرک بن جانا معجزۂ فن کی دلیل ہے۔تخلیق کی اس معجز نمائی کا مشاہدہ کرنا ہو تو کلام اقبال کا مطالعہ کیا جائے۔صرف یہی موضوع پیشِ نظر رکھیے تو حیرتوں کا ایک جہان دیگر دکھائی دے گا۔اقبال کے سرمایۂ قلم میں نہ نعت ہے اور نہ سیرتِ رسولؐ پر کوئی کتاب مگر تخلیقات میں ذکر حبیبؐ کی نور فشانی ہر سو جلوہ گر ہے۔کہیں برملا و بے حجاب ہے تو کہیں پُر اسرار حرفِ راز بن کر معنی کے نہاں خانوں میں پوشیدہ۔اس ادراک کے لیے نگاہ کا شریک بینائی ہونا لازم ہے۔تخلیقی تاریخ میں یہ ایک منفرد مثال ہے۔

شعراء اور سِیر نگاروں نے پیغمبرِ اعظم وآخرؐ کی سیرت وشمائل کے بیان میں بے مثال عشق وعقیدت کا اظہار کیا ہے۔تاریخ وتلمیح کے سہارے عرفانِ رسالت کے جو نذرانے قلم بند کیے ہیں وہ بنی نوع انسان کی علمی وتخلیقی سرمایہ کا بیش بہا ذخیرہ ہے۔کائنات کی کسی شخصیت سے نہ یہ عشق ملتا ہے اور نہ سرمایۂ علمی ہی محفوظ کیا گیا ہے۔یہ مسلمانوں کی سب سے عظیم اور مقدس سعادت ہے۔اقبال کا یہی خاص امتیاز ہے کہ حضور رسالتِ مآبؐ سے ان کا عشق اور وفورِ شوق جذب وجنوں کی انتہاؤں سے ہم آہنگ ہے۔اس کے ساتھ انہوں نے رسولِ کریمؐ کی ذاتِ مبارک کو حکمت ودانائی میں سراپا نور قرار دیا ہے۔یہ مفکرانہ نسبت اقبال کو بہت محبوب ہے کیوں کہ آنحضرتؐ کی شخصیت مفکر اعظم وآخر کی ہے۔اقبال نے اپنے عشق کو وجدان والہام سے ہم آمیز کیا ہے۔جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔احادیث کے انتخاب میں یہ پُر اسرار نکتہ پیش نظر رہا ہے۔اس موضوع پر گفتگو میں اقبال کے اس اقرار واعتراف پر توجہ لازم ہے۔

ایں ہمہ از لطف بے پایانِ تست
فکرِ ما پروردۂ احسانِ تست

(درحضور رسالت مآبؐ پس چہ باید کرد)

اقبال اعتراف کرتے ہیں کہ حضور اکرمؐ کے بیکراں لطف وعنایت کے آغوش میں ان کے فکر ونظر کی پرورش ہوئی ہے۔اس بے پایاں احسان کا اقرار مطالعۂ اقبال میں بڑی معنویت رکھتا ہے۔اقبال کی دروں بینی کے اس احساس تک دریابی کے لیے دیدۂ بینا درکار ہے۔گویا ان کے فکری نظام کا مصدر اعظم نبی برحق کی ذات گرامیؐ ہے۔اقبال نے اشارے کیے ہیں کہ ان کے علم ومطالعہ میں دانشِ افرنگ نے اضافہ کیا ہے۔اور مشرق کے صاحبِ نظراں نے سینے کو پُرنور کیا ہے مگر خاکِ مدینہ نے فکر ونظر اور لوح وقلم کو بینائی بخشی ہے۔اقبال معترف ہیں کہ عالم آب وخاک میں اسی کے ظہور سے سب کو فروغِ نظر حاصل ہے۔اسی ذات مبارک کی بدولت ہر ذرۂ ریگ کو طلوعِ آفتاب کی تابانی میسر ہے۔اس ذات تک رسائی ہی دین ودانش کا مقصود ومنتہا ہے۔

اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

کلامِ اقبال میں عشق وعقیدت کے بے پایاں جذب وشوق کی سایہ نشینی سے پوری فضا جمال آفریں ہے۔کیوں از کہ

از خدا محبوب تر گردد نبیؐ

جب یہ صورت ہو تو محبوب کے تمام متعلقات یا مناسبات سبھی عزیز تر ہوتے ہیں۔سیرت وشخصیت کے ساتھ اقوال وکردار کی سبھی ادائیں جسم وجان سے زیادہ پیاری ہوجاتی ہیں۔اقبال کے اشعار میں جگہ جگہ اسوۂ رسولؐ یا منصبِ نبوت کا تذکرہ ہے۔ساتھ ہی ذاتِ اقدسؐ کے ارشادات کا حوالہ بھی منظوم ہوا ہے۔

فکرِ اقبال کا سب سے اہم سرچشمہ قرآن ہے۔اقبال کی تحریروں میں قرآن کریم کے حوالے جس کثرت سے ملتے ہیں وہ تخلیقی ادب میں ایک نایاب نظیر ہے۔شعرا قبال کی بلاغت اور فکر کی بلندی کا ایک اہم سبب صحفِ سماوی کے حوالے ہیں۔اقبال کی آرزو تھی کہ وہ قرآن کی تفسیر قلم بند کرتے۔دوسرے تصنیفی منصوبوں کی طرح یہ اہم کام بھی انجام نہ پاسکا۔رموزِ بیخودی میں سورۂ اخلاص کی منظوم تشریح وتعبیر ان کی بنیادی فکر کے اہم ترجمان بن گئے ہیں۔مختصر سورت کے لیے ایک سو سولہ اشعار منظوم کیے گئے ہیں۔قرآن اور اقبال کے سلسلے میں

اقبالیات میں قابل قدر سرمایہ موجود ہے۔ مستعمل آیات میں جن نکات کی طرف اقبال کے اشارے ہیں وہ اقبال کے تفسیری رویے کی نشان دہی کرتے ہیں۔

اقبال نے نثری تحریروں میں بھی آنحضرتؐ کے اقوال قلم بند کیے ہیں اور ان کی فلسفیانہ تشریح بھی کی ہے۔ قرانی آیات کے ساتھ احادیث رسولؐ کی شرح وتفصیل بھی اقبال کے پیشِ نظر ہے۔ انہوں نے خطبات میں سیرت سرورِ کونینؐ کے حکیمانہ پہلوؤں پر اپنی وسعتِ نظر کا اظہار کیا ہے۔ ''مضامین اقبال'' میں آنحضرتؐ کے قولِ مبارک پر ایک مقالہ قلم بند کیا ہے جو نظریۂ ادب کا سب سے اہم اور مہتم بالشان ضابطۂ تخلیق کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس مقالے کا عنوان ہے ''جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ'' میں آنحضرتؐ نے امراء القیس کی شاعری پر ارشاد فرماتے ہوئے کہا تھا کہ ''**اشعر الشعرا و قائدھم الی النار**'' یعنی وہ شاعروں کا سردار تو ہے مگر جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے۔ تخلیق کا یہ نصب العین نہیں ہے کہ حقائق زندگی سے گریز سکھائے اور تخیلات کی ساحری میں گمراہ کرے۔ ادب نشاطِ زیست کا ترجمان نہیں ہے۔ گویا فن برائے فن ایک اندوہ ناک تصور ہے۔ اسی حدیث کو اقبال نے مرقعِ غالب کے مقدمہ میں بھی دہرایا ہے۔[1] اسی مقالے میں اقبال نے مشہور شاعر عنترۃ کے شعر پر آنحضرتؐ کی تعریفی کلمات کو نقل کیا ہے کہ آپؐ نے فرمایا ''کسی عرب کی تعریف نے میرے دل میں اس کا شوق ملاقات نہیں پیدا کیا لیکن میں سچ کہتا ہوں کہ اس شعر کے نگارندے کو دیکھنے کو میرا دل بے اختیار چاہتا ہے۔[2] عنترہ کا شعر صحت بخش زندگی کی جیتی جاگتی اور بولتی تصویر ہے جو تعیش کی جگہ سخت کوشی وجد وجہد کو دعوت دیتی ہے۔ یہی تخلیق کا معراج ہے کہ زندگی کی کشاکشوں سے نبرد آزما ہو۔ گویا آپ نے چودہ سو برس پہلے ادب برائے زندگی کو خوش آمدید کہا تھا۔

'تشکیل جدید الہیات اسلامیہ'' کے پہلے خطبہ علم اور مذہبی مشاہدات میں مشہور حدیث 'لاتسبو الدھر' کی تشریح کی گئی ہے اس سے یقین ہوتا ہے کہ احادیث نبویؐ سے فکرِ اقبال کو ایک فلسفیانہ گرویدگی ہے۔ عقیدت واحترام سے قطع نظر انہیں اقوال رسولؐ سے مفکرانہ نسبت ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے سرورِ کونینؐ کو حکمت ودانائی کا عظیم پیکر تسلیم کیا ہے۔ اشعار میں دانائے سبل، گوہر حکمت، الکتاب اور لوح وقلم کے معنی خیز الفاظ موجود ہیں۔

۱۔ مرقعِ غالب، عبدالرحمٰن چغتائی لاہور ۱۹۲۶ ۲۔ مضامینِ اقبال ۱۳۶۲ھ ص۔ ۷۷

گوہر ِ حکمت بہ تارِ جان ِ امت سفتۂ ای

(باقیات)

درجہانِ ذکر وفکر ِ انس وجاں تو صلوتِ صبح تو بانگِ اذاں
ذکر وفکر وعلم وعرفانم توئی کشتی ودریا وطوفانم توئی
تیری نگاہ ِ ناز سے دونوں مراد پاگئے عقل غیاب وجستجو عشق حضور واضطراب

اشعار میں منظوم احادیث کی فکر افروز حکمت بہت نمایاں ہے اقبال مفکر شاعر ہیں۔ لازم تھا کہ ایسے ہی اقوال کا انتخاب ہو جو فلسفیانہ جہانِ معنی سے معمور ہوں۔ اقبال نے احادیث سے اجتہادی استدلال بھی کیا ہے۔ جیسے آپؐ کا قول 'لا نبی بعدی' اس کا منطقی نتیجہ ہوگا کہ لاقوم بعدی۔ اس سے اقبال کے فکری منہاج ومعیار اور طریقِ استلال کا اندازہ ہوتا ہے۔

اقبال نے تخلیقی حسن آفرینی کے ساتھ کلام میں احادیث رسولؐ کو جزوِ فن بنا دیا ہے۔ حدیث پاک کے حوالوں کی کثرت فارسی شاعری میں ہے یہ اردو میں بہت کم منظوم ہوئے ہیں۔ باقیات میں حسبِ ذیل احادیث منظوم کی گئی ہیں۔

تیرا رتبہ جوہرِ آئینہ ٔ لولاک ہے [۱]
اے کہ حرفِ اطلبو الوکان بالسین گفتہ ای [۲]
ماعرفنا نے چھپا رکھی ہے عظمت تیری [۳]

یہ دونوں مصرعے نظم ''اسلامیہ کالج کا خطاب پنجاب کے مسلمانوں سے'' اور 'فریادِ امت سے' ماخوذ ہیں۔ نظم ''ماتم پسر'' کا مصرع ہے۔

مقصد لحمک لحمی پر کھلی ان کی زبان [۴]

اردو کلیات میں بس برائے نام حوالے ہیں۔ نظم ''ہندوستانی بچوں کا قومی گیت'' کا یہ مصرع ضعیف حدیث کا ترجمہ قرار دیا گیا ہے۔

۱۔ کلیاتِ باقیاتِ شعرا قبال ص۔۴۲
۲ // // // // ص۔۹۹
۳ // // // // ص۔۱۱۰
۴ // // // // ص۔۱۱۴

میر عربؐ کو آئی ٹھنڈی ہوا جہاں سے

''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' کے مصرع میں مشہور حدیث منظوم ہے۔

سماں الفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

بال جبریل کی غزل ۴۶ کے مقطع میں بھی یہ حدیث دہرائی گئی ہے۔

جہاں مقام ہے میراث مرد مومن کی
میرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اردو کے مجموعوں میں ذکر حدیث کی یہ صورت نہیں ہے سبب نہیں معلوم کہ ایسا کیوں ہوا؟ یہ ضرور ہے کہ فارسی میں موضوعات اور مواقع مختلف النوع ہیں۔ ان حوالوں کی وہاں زیادہ گنجائش تھی۔ راقم کا یہ محض قیاس ہے۔

قرآن کریم کی طرح اقبال نے اقوالِ رسولؐ سے بھی اپنے فکر ونظر کی تشکیل میں بڑی مدد لی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ فلسفہ زمان ومکاں کے سلسلے میں اقبال فکری طور پر اضطراب سے دوچار تھے۔ معاصر علما واکابرین دانش سے دریافت کرتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان کی رہ نمائی نہ ہوسکی۔ لیکن انہیں حدیثِ رسولؐ نے بڑی استقامت بخشی۔ اسرارِ خودی، ان کی پہلی شعری اور فکری تخلیق ہے۔ خودی کے وجود نمود اور پہنائی کا مسئلہ خاصا پیچیدہ تھا۔ انہوں نے قول نبیؐ سے مدد لی اور زمان ومکاں کے تصورات کو مربوط کیا۔

زندگی از دہر ودہر از زندگی است
لا تسبو الدھر فرمانِ نبیؐ است

اقبالیاتی مطالعہ میں یہ موضوع خاصا اہم اور دقیق مسائل پر مشتمل ہے۔ انہوں نے رموزِ بیخودی اور پیام مشرق میں الوقت سیفٌ اور 'نوائے وقت' کے عنوان سے نظمیں لکھی ہیں۔ 'زمانہ' کے نام سے بال جبریل میں بھی ایک نظم کے علاوہ متفرق اشعار ہیں جو اس فکری نکتے کی وضاحت کرتے ہیں۔ ضربِ کلیم کا یہ شعر بڑی حکیمانہ معنویت کا حامل ہے۔

خرد ہوتی ہے زمان ومکاں کی زناری
نہ ہے زماں نہ مکاں لا الہ الا اللہ

'اسرارِ خودی' میں سب سے پہلے اس حدیث پر نظر پڑتی ہے جو 'خودی از سوال ضعیف می گردد' کے ذیل میں نقل کی گئی ہے۔

آں کہ خاشاکِ بتاں از کعبہ رفت
مردِ کاسب را حبیب اللہ گفت

ذاتِ گرامیؐ کا ارشاد ہے 'الکاسب حبیب اللہ' یعنی محنت کش مزدور اللہ کا دوست ہے۔

تا کجا روز وشب باشی اسیر
رمزِ وقت از لی مع اللہ یاد گیر

حدیث لی مع اللہ وقت کی طرف اشارہ ہے۔

'رموزِ بیخودی' میں پہلی حدیث ہے۔

بہرآں شہزادۂ خیر الملل دوش ختم المرسلین نعم الجمل

یہاں حدیث ونعم الجمل جملکما ونعم العدلان انتما کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

پیشِ پیغمبر چو کعب پاک زاد ہدیۂ آورد از بانت سعاد
گفت سیف من سیوف اللہ گو حق پرستی جز براہِ حق مپو

آپ کا قول ہے ''سیف من سیوف اللہ'' اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار پیغمبرِ اعظم وآخرؐ کے بارے میں ایک بہت مشہور اور معتبر حدیث مروی ہے۔

کنت بنیا و آدم بین الماء ِ والطین
جلوۂ او قدسیاں را سینہ سوز بود اندر آب وگل آدم ہنوز

ترمذی شریف میں ہے قال آدم بین الروح والجسد (کہا اور آدم ابھی روح اور جسد کے مابین تھے)

ایک دوسری حدیث کو اس طرح منظوم کیا گیا ہے۔

آنکہ ناز دبر وجودش کائنات ذکر او فرمود باطیب وصلوۃ

سورہ اخلاص کی تفسیر میں حدیث کا اشارہ ملتا ہے۔

آں امنّ الناس بر مولائے ما آں کلیم اولِ سینائے ما

حدیث کے الفاظ ہیں۔ امنّ الناس علیّ فی صحبتہٖ ومالہٖ ابوبکر

لست منّی گویدت مولائے ما وائے ما اے وائے ما اے وائے ما

آپ نے فرمایا تو میری قوم سے نہیں ہے۔

'پیام مشرق' میں ایک آیت کریمہ کا حوالہ ہے مگر حدیث کا ذکر نہیں ہے۔ ہاں اقبال کا نشتے کے بارے میں جو مصرع بہت مقبول ہوا۔

قلبِ او مومن دماغش کافر است

محسوس ہوتا ہے کہ بدونِ حوالہ آنحضرتؐ کے ایک قول کا اشارہ ہے۔ حضور رسالتِ مآبؐ کے عرب شاعر امیہ ابن الصلت کے لیے فرمایا تھا۔ **امن لسانہٗ و کفر قلبہٗ**

اقبال کے مطالعہ اور یادداشت کو آفریں ہو کہ انہوں نے احادیث واقوال کو حافظے کے نہاں خانے میں محفوظ رکھا اور تخلیق میں نگیں سازی سے کام لیا۔ ان کے کئی اشعار بدون حوالۂ حدیث کے بھی ہیں جن میں جزوی عبارت یا اشارے موجود ہیں۔ حدیث کے بے کراں ذخیرۂ علمی پر ان کی حکیمانہ نگاہ ہے۔ جن کی مدد سے وہ کلام کو علمی تقدیس سے ہم آمیز کرتے ہیں۔ تخلیق کو تقدیس کے مقام معراج تک رسائی کے لیے اقبال کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ مشرقی ادبیات میں اقبال کا یہی مقام محمود ہے۔ بنی نوع بشر کی نغمہ سرائی فکرِ اقبال کا سب سے نمایاں امتیاز وافتخار ہے۔ وحدتِ آدم کے تصور پر اقبال سے زیادہ کسی مفکر نے توجہ نہیں دی ہے۔ انہوں نے قوموں کی وحدت کو اندوہ ناک بتایا ہے۔ اور وحدت آدم کو ترجیح دی ہے۔ اس تصور کے سرچشمے احادیث نبویؐ میں موجود ہیں۔ تمام عالم کو عیال اللہ کہا گیا ہے۔ اقبال کا شعر ملاحظہ ہو جس میں حدیث کا حوالہ نہیں ہے۔ مگر مفہوم کی معنویت پورے موثرات کے ساتھ موجود ہے۔

حرفِ بد را برلب آوردن خطا است کافر ومومن ہمہ خلقِ خدا است

اس طرح کے کئی اشارے کلام میں قلم بند ہوئے ہیں جو حدیث کے ترجمان ہیں۔

'زبور عجم' اور 'گلشنِ راز جدید' میں بھی بہ ظاہر کوئی حدیث درج نہیں ہے۔ 'جاوید نامہ' میں کئی حدیثیں نقل کی گئی ہیں۔ جو موقع کی مناسبت سے بہت موزوں ہیں اور فکر کی تازگی اور تمازت سے معمور ہیں۔ ان کی مدد سے اقبال نے اپنے افکار کو معنویت سے آراستہ کیا ہے۔ زاوان کہ روح زمان ومکانست کے ذیل میں حدیث پر نظر پڑتی ہے۔ اس حدیث کو دو شعروں میں دہرایا گیا ہے۔

لی مع اللہ ہر کرا در دل نشست آن جواں مرد ے طلسم من شکست

گر تو خواہی من نباشم درمیاں لی مع اللہ باز خواں از عینِ جاں

اس سے قبل اس حدیث پاک کو 'اسرارِ خودی' میں بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کو زمان و مکاں کے تصورات کی تشکیل و تعبیر میں سرورِ کونینؐ کے ارشاد سے توثیق و تصدیق ہوئی۔ جاوید نامہ میں دوسری حدیث بھی بڑی خوبی سے شعر میں ڈھالی گئی ہے۔ افغانی کی زبان سے ادا کی گئی ہے۔

از حدیث مصطفیٰ ؐ داری نصیب دین حق اندر جہاں آمد غریب

حدیث ہے کہ 'الاسلام جاء غریب.....

یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ صرف ایک لفظ سے حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ متن کو پیش نہ کر کے صرف ایک لفظ سے پوری حدیث کو مخاطب کیا گیا ہے۔ اقبال نے کئی مقامات پر قرآن کی آیات کے ساتھ بھی اختصار و اشارے کی اس صورت سے کام لیا ہے۔ جاوید نامہ میں خواجۂ اہل فراق کی زبان سے حدیث پاک نقل کی گئی ہے۔

گفتمش ''بگذر زآئینِ فراق ابغض الاشیاء عندی الطلاق

جاوید نامہ کے اختتام 'خطاب بہ جاوید' کے آخر میں دو حدیثوں کا ذکر ہے۔

ضعیف ایمان است و دل گیری است غم نوجوانا ! نیمۂ پیری است غم

نیمۂ پیری سے اشارہ ہے اللھم نصف الحرام

می شناسی ؟ حرص فقر حاضر است من غلام آنکہ بر خود قاہر است

یہاں بھی فقرِ حاضر کہہ کر حدیث مراد ہے جس کا متن ہے۔ ایّاکم والطمع فانّہٗ الفقر الحاضر

کبھی کبھی شعری ضروریات یا مجبوری کے سبب بھی صرف اشاراتی الفاظ سے کام لیا جاتا ہے۔ اقبال نے بھی ایسا کیا ہے۔ اگرچہ عام قاری کی بساط فہم کے لیے یہ اشارے مشکل ہوتے ہیں۔ لیکن شارحین اور مترجمین نے تفہیم آسان کر دی ہے۔ اقبال نے اقرار کیا ہے کہ سیلِ معانی کو ضبط کرنا بہت مشکل تھا۔ پھر بھی قلندر نے اسرارِ کتاب کی وضاحت کر دی۔

مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوام شرق' ایک مختصر شعری مجموعہ ہے جو ۱۹۳۶ء میں پہلی بار شائع ہوا تھا۔ اس میں بھی چند احادیث مذکور ہیں۔ 'فقر' کے ذیل میں یہ شعر ہے جس میں متن کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے حدیث کا متن یا اس کا کوئی حصہ نقل نہیں کیا گیا ہے۔

مومناں را گفت آں سلطانِ دیں مسجد من ایں ہمہ روئے زمیں

حضور اکرمؐ کی مشہور حدیث کی طرف تلمیح کا اشارا ہے۔جس میں ارشادِ رسولؐ کے مطابق ''تمام روئے زمین میری مسجد ہے'' 'دراسرارِشریعت' میں دوسری حدیث ہے۔

مال را گر بہرِ دیں باشی حمول نِعمَ مَالٌ صَالِحٌ گوید رسولؐ

اسی نظم میں تیسری اورانتہائی فکرانگیز حدیث پاک کومنظوم کیا گیا ہے۔

آہ یورپ زیں مقام آگاہ نیست چشمِ او ینظر بنور اللہ نیست

آپؐ نے فرمایا کہ مومن کی فراست سے ڈرو کیوں کہ مومن اللہ کے نور سے دیکھتا ہے۔ ''اتقو فراست المومن فانه ینظر بنور الله''

'سیاسیاتِ حاضرہ' نظم میں ایک بہت ہی مشہور حدیث کومنظوم کیا گیا ہے۔

در بدن داری اگر سوز حیات ہست معراج مسلماں در صلوٰت

اس تلمیح میں قولِ نبیؐ کو دہرایا گیا ہے کہ نماز مومن کے لیے معراج ہے۔الصلوۃ معراج المومنین۔

نظم 'حرفے چند با امتِ عربیہ' کا مطلع ہے۔

اے در و دشتِ تو باقی تاابد نعرۂ لا قیصر وکسریٰ کہ زد

ذاتِ گرامی کا ارشاد ہے کہ ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ....

مثنوی 'مسافر' میں حسب ذیل حدیث پاک کی تلمیح موجود ہے۔لی خرقتان الفقر والجھاد

خرقۂ آں '' برزخ لا یبغیان دید مش در نکتہ لی خرقتان

یہاں قرآن اور حدیث دونوں کی تلمیح موجود ہیں۔'ارمغانِ حجاز' میں بھی چند اقوال رسالت مآبؐ کے حوالے بہ طور تلمیح موجود ہیں۔ایک رباعی کے آخری شعر میں 'من رانی فقد راء الله' کومنظوم کیا گیا ہے۔ مشہور حدیث۔

دو چارم کن بہ صبح 'من رانی' شمم را تابِ مہ آوردۂ تست

حدیثِ پاک کا مفہوم ہے ''جس نے مجھے دیکھا اس نے اللہ کو دیکھا'' ارمغان کی ایک رباعی میں دو حدیثوں کو دو شعروں کے قافیے میں قلم بند کر کے اقبال نے جذبِ دروں کو شعری پیکروں میں پیش کیا ہے۔

مسلماں را ہمیں عرفان وارد اک کہ در خود فاش بیند رمزِ لولاک

خدا اندر قیاسِ ما نگنجد شناس آں را کہ گوید ما عرفناک

ذاتِ گرامیؐ کے مقام ومنصب کے عرفان وایقان کے لیے دونوں حدیثیں بار بار پیش کی گئی ہیں یعنی کائنات کی تخلیق کا سبب ذاتِ مبارک کا وجود ہے۔ گویا آپ نہ ہوتے تو عالم افلاک نہ ہوتا نہ یہ ارض وسما ہوتے نہ ہی کوئی شے خلق ہوتی۔ دوسری حدیث کو اقبال پہلے بھی نقل کر چکے ہیں۔ **'ماعرفناک حق معرفتک'** محمدؐ کا عرفان ہی اللہ کا عرفان ہے یعنی آنحضرتؐ کے عرفان کے بغیر ذاتِ باری تعالیٰ کا عرفان ممکن نہیں ہے۔ جیسے کہ رسولؐ کی محبت یا اطاعت ہی اللہ سے محبت اور اس کی اطاعت ہے۔ یہی مرکز محبت ہے اور یہی مقامِ نبوت بھی جس کے ذکر وفکر سے اقبال کا کلام اپنی نور فشانی میں بے نظیر تخلیقات کا روشن آتش کدہ ہے۔ جس میں نورِ نبوت کا ہر شرر شعلۂ جہاں تاب کی طرح جلوہ ساماں ہے۔ سیرتِ رسولؐ کے کردار وگفتار سے نسبتوں کے فسانے اور زمانے دونوں عجیب ہیں جو فردائے قیامت تک کے لیے سخن کے سوز وگداز کو حقیقت ابدی میں بدل دیتے ہیں۔ اس معروضے اور مشاہدے کے لیے بارِ ثبوت کے طور پر کلام اقبال کافی ہے۔

پروفیسر توقیر احمد خاں
سابق صدر شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی

اقبال کی نظم 'کفر و اسلام'
کا تجزیہ اور مومن کی صفات

یہ 'بانگ درا' کی نظم ہے جو کتاب کے حصہ سوم میں شامل ہے۔ اس نظم میں حق اور باطل کے فرق کو واضح کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حق، باطن اور پوشیدہ ہے ہمیشہ رہنے والا ہے جب کہ باطل ظاہر اور موجود تو ہے مگر فنا ہونے والا ہے اس نظم میں پانچ تلمیحات ہیں۔

اوّل یہ کہ یہ شعر ایران کے شاعر رضی دانش مشہدی کے شعر پر تضمین ہے۔ یہ ایران کے شہر مشہد کا رہنے والا تھا۔

'عہد شاہجہانی میں اپنے باپ کے ساتھ ہندوستان آیا۔ بادشاہ کی خدمت میں ایک قصیدہ لکھ کر پیش کیا، جس کا مطلع تھا:

بخواں بلند کہ تفسیر آیۂ کرم است　　خطے کہ از کفِ مبارکش پیداست

شاہجہاں نے خوش ہو کر دو ہزار روپے کا انعام دیا۔ کچھ عرصہ بعد بادشاہ کو چھوڑ کر اس نے دارا شکوہ کی ملازمت اختیار کر لی۔ اس عقل مند شہزادہ نے اس کو ایک شعر پر ایک لاکھ روپے انعام دیا:

تا ک را مربز کن اے ابر نیساں در بہار　　قطرۂ تامی تواند شد چرا گوہر شود'

(یوسف سلیم چشتی، شرح بانگ درا، ص 635)

دوم: کلیم طور یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام انھوں نے کوہِ طور پر تجلی خداوندی کا نظارہ کیا تھا۔ وادیٔ سینا وہ پہاڑی خطہ ہے جہاں کوہِ طور واقع ہے۔ وادیٔ سینا کے اس پہاڑ کو طورِ سینا بھی کہتے ہیں۔

سوم: آتش نمرود، نمرود بادشاہ تھا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا تھا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا کر ختم کر دینے کے لیے بہت بڑا الاؤ لگایا تھا لیکن اللہ کے حکم سے آگ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جلا نہ سکی اور ان کے لیے ٹھنڈی اور سلامتی والی ہو گئی۔

چہارم: ایمان خلیل، حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسا کامل یقین انھوں نے اللہ کی رضا کی خاطر گھر بار

چھوڑا۔لختِ جگر حضرت اسماعیل کو قربان کیا اور خود انھیں آگ میں ڈالا گیا۔لیکن بحکم ایزدان کو کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا۔ یہ ایمان خلیل ہے۔

پانچویں: وادئ فاراں، یہ وہ وادئ بے آب و گیاہ ہے جہاں حضرت ابراہیم نے اپنے شیر خوار بچے اور بیوی حضرت ہاجرہ کو تن تنہا چھوڑ دیا تھا۔وہ پانی کی تلاش میں صفا و مروہ پر دوڑتی تھیں آخر کار ایک دن سارا سامان خورد و نوش ختم ہو گیا تو پیاس کی شدت سے بچہ حضرت اسماعیل نے تڑپ کر زمین پر ایڑیاں رگڑ دیں جن کی رگڑ سے اللہ تعالیٰ نے میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا اس کو حضرت ہاجرہ نے انگلی سے گھیرا بنا کر روک دیا اور کہا زم زم تھم جا تھم جا وہ آب زم آج تک جاری و ساری ہے۔

نظم کا مطلب یہ ہے کہ ایک دن اقبال نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ آتش کفر یعنی نمرود کی آگ تو آج بھی ہر جگہ موجود ہے اور خوب تیزی سے بھڑک رہی ہے لیکن تو نے جو تجلی خداوندی کی روشنی دیکھی تھی وہ نور اور اس کی جلن کیوں آنکھوں سے پنہاں ہو گئے۔تو حضرت موسیٰ نے جواب دیا کہ تو اگر مسلم ہے تو غائب کو چھوڑ کر ظاہر پرستی اور حاضر کا شیدائی نہ بن۔اور اگر تجھ کو حاضر و موجودات کا ذوق ہے تو پھر اس کا مقابلہ کرنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ جیسا ایمان بھی پیدا کر۔ورنہ حاضر و موجود کی آگ تجھے جلا کر راکھ کر دے گی۔اور اگر تو غائب کا دیوانہ ہے تو شریعت کی پابندی کر اور ظاہری شعلوں کی کچھ پرواہ نہ کر اور وادئ فاران میں حضرت ہاجرہ کی طرح خیمہ گاڑ دے اور رحمتِ خداوندی کا انتظار کر۔کیوں کہ ظاہر داری اور حاضر کی شان و شوکت عارضی ہے یہ اہل کفر کی علامات میں سے ہے وہی بت گرامی و بت پرستی کرتے ہیں، حاضر و موجود کی عبادت کرتے ہیں۔اور غائب یعنی جو نگاہوں سے پوشیدہ ہے وہ ذات خداوندی ہے۔حق و صداقت ہے وہ ہمیشہ باقی رہنے والی ہے اور اس حقیقت کو راہِ محبت میں ایسا تعلق ہے جیسا جان اور تن کا ربط یعنی محبت سے یہ یقین اور کامل ہو جاتا ہے کہ روح باقی رہنے والی شئے ہے نورانی و براقی ہے اور جسم ختم ہونے والا ہے یعنی حاضر اور ظاہر ہے مٹی کے اصنام کی طرح۔تو اے اقبال تو ظاہر و باطل کو چھوڑ کر باطن اور غائب پر ایمان لا۔ شعلہ نمرود اگر دنیا میں بھڑک رہا ہے تو اس کی کچھ پروا نہ کر کیوں کہ وہ ایک دن خود بخود ٹھنڈا ہو جائے گا جس طرح شمع انجمن میں اپنے آپ کو جلاتی تو ہے لیکن رفتہ رفتہ اپنے وجود کو ختم کر دیتی ہے اس لیے ہمارا نور چقماق پتھر کی طرح نظروں سے پوشیدہ ہی رہنے میں بہتر ہے۔یعنی ایمان بالغیب ہی میں عافیت ہے وہی اصل شئے ہے جیسا کہ خود اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے:'ھدی للمتقین الذین یومنون بالغیب ویقیمون الصّلوۃ وممارزقنھم ینفقون. گویا ہدایت ان کے لیے جو غائب پر ایمان لاتے ہیں نماز ادا کرتے اور جو کچھ اللہ نے دیا ہے، اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اقبال ایک ایسا حیران کن شاعر ہے کہ شعرائے عالم کے برخلاف ان کے یہاں دو متضاد قوتیں یا دھاریں (Streams) ساتھ ساتھ چلتی ہیں۔مثلاً خدا اور شیطان، حب الوطنی و قوم پرستی، فرد اور ملت، ذات اور جماعت، عمل اور سکون، خلوت اور جلوت، کفر اور ایمان، مومن و کافر، تقدیر اور تدبیر، جسم اور روح، ظاہر اور باطن وغیرہ

کلام اقبال سے ان میں سے ایک ایک کا تجزیہ کرنا چاہیں گے تو محسوس ہوگا کہ اقبال ہر ایک کی تعریف میں ثنا خوں ہیں۔ بالکل اسی طرح اقبال جس طرح سے جسمانی طاقت، جہد وعمل اور ظاہری قوت کے طرف دار ہیں اسی طرح وہ روحانی قدرت، باطنی خصوصیات اور کشف وکرامات کے بھی مبلغ ہیں۔ وہ بار بار یاد لاتے ہیں کہ مسلمان کا جسم تو باقی ہے مگر اس کی روح نکل چکی ہے۔ روحانی مراتب کے لیے ان کے یہاں تصوف کے مراتب کی طرح ولی، ابدال اور قطب وغیرہ کی مانند مسلمان کی ہیئت کے لیے مومن، مرد مومن، فقیر اور درویش یا قلندر کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں۔ مسلمان یعنی خدا کا نائب یا فی الارض خلیفہ بننے کے لیے پہلا درجہ مومن کا ہے۔ مومن یا مسلمان کون ہے اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت　　یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

پھر بتاتے ہیں کہ مومن کون ہے اور کون شخص مومن کہلانے کا مستحق ہے:

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان　　گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان
ہمسایۂ جبریل امیں بندۂ خاکی　　ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشان
یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن　　قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے　　دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

مومن کے معنی امن والا یا insured کے ہیں وہ اللہ کے دین حق کی خدمت واشاعت کے لیے وقف ہے۔ وہ غارت گر باطل ہے اور تھا مگر اب وہ جذبہ ناپید ہے:

تیری نگاہ سے دل سینوں میں کانپتے تھے　　کھویا گیا ہے تیرا جذب قلندرانہ
وہ سجدہ روح زمیں جس سے کانپ جاتی تھی　　اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب

اس جذبہ قلندرانہ اور روحانی تعلق سے وہ آج عاری ہو چکا ہے۔

محبت کا جنوں باقی نہیں ہے　　مسلمانوں میں خوں باقی نہیں ہے
صفیں کج دل پریشاں سجدہ بے ذوق　　کہ جذب اندروں باقی نہیں ہے

ایمان کی صفت اختیار کرنے کے بعد اگلا قدم فقر کا ہے یعنی مومن فقیر کے مرتبہ کو پہنچتا ہے۔ فقر کیا ہے اس کی تعریف کرتے ہوئے سمجھاتے ہیں:

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری　　اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہاں گیری
اک فقرہ سے مٹی قوموں میں مسکینی ودل گیری　　اک فقر سے مٹّی میں خاصیتِ اکسیری
اک فقر ہے شبّیری اس فقر میں ہے میری　　میراثِ مسلمانی سرمایۂ شبّیری

کمال ترک نہیں آب و گل سے مہجوری　　کمال ترک ہے تسخیر و نوری
میں اسے فقر سے اے اہل حلقہ باز آیا　　تمہارا فقر ہے بے دولتی و رنجوری

جب مومن فقر کی حقیقت سے آگاہ ہوجاتا ہے تو اس کی نگاہوں میں اسرار جہاں گیری یعنی پوشیدہ راز نمایاں ہوجاتے ہیں اور وہ اس فقر کی بدولت صفات جہاں گیری کا حامل ہوجاتا ہے:

یہ فقر مرد مسلماں نے کھو دیا جب سے　　رہی نہ دولت سلمانی و سلیمانی
نہ مومن ہے نہ مومن کی اسیری　　رہا صوفی گئی روشن ضمیری
خدا سے پھر وہی قلب و نظر مانگ　　نہیں ممکن امیری بے فقیری
یہ ذکر نیم شبی یہ مراقبے یہ سرور　　تری خودی کے نگہباں نہیں تو کچھ بھی نہیں
خرد نے کہہ بھی لاالٰہ تو کیا حاصل　　دل و نگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

- اقبال کی شاعری میں شاہین کی علامت بہت زیادہ استعمال ہوئی ہے۔ علی گڑھ میں فلسفہ کے پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے نام ایک خط میں انھوں نے بتایا کہ شاہین کا استعارہ محض شاعرانہ نہیں ہے بلکہ اس جانور میں اسلامی فقر کی تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ 'خوددار اور غیرت مند ہے اور مارا ہوا شکار نہیں کھاتا۔' مرد مومن بھی مالِ حرام کو نہیں چھوتا محنت سے کماتا ہے اور پھر کھاتا ہے۔
- دوم یہ کہ 'خلوت پسند ہے۔' اللہ والے بھی تنہائی میں بیٹھ کر یادِ الٰہی کا ذکر کرتے ہیں۔
- سوم یہ کہ 'تیز نگاہ ہے' مرد مومن کی نگاہ بھی تیز ہوتی ہے بعید از فہم چیزوں کو بھی دیکھ لیتا ہے۔
- چہارم یہ کہ 'بلند پرواز ہے' مرد مومن کی پرواز بھی بلند ہے۔ اس کی فہم و فراست آسمانوں پر کمند ڈالتی ہے۔ کائنات کا کوئی کونہ اس کی پہنچ سے باہر نہیں۔
- اور پانچویں یہ کہ 'وہ بے تعلق ہے آشیانہ نہیں بناتا' اس طرح مرد مومن بھی دنیا میں رہنے کے لیے نہیں آیا اس کا ٹھکانہ چرخ نیل فام سے بھی اوپر ہے:

پرے ہے چرخ نیل فام سے منزل مسلماں کی

یہ صوفی یا فقیر یہ درجہ دوم تھا۔ اس کے بعد مسلمانیت کی آخری منزل آتی ہے جس میں مومن کائنات میں نہیں بلکہ مومن میں کائنات نظر آتی ہے۔ جب بندہ دو عالم سے بے نیاز ہوجاتا ہے تو یہ دنیا اس کی ٹھوکروں میں آن گرتی ہے:

یہ غازی یہ تیرے پُراسرار بندے　　جنھیں تو نے بخشا ہے ذوقِ خدائی
دو نیم ان کی ٹھوکر سے صحرا و دریا　　سمٹ کر پہاڑ اُن کی ہیبت سے رائی

دو عالم سے کرتی ہے بے گانہ دل کو عجب چیز ہے لذتِ آشنائی
کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

جب مومن الٰہیانہ صفات کا حامل ہوجاتا ہے تو کائنات اس کے اشارہ پر چلنے لگتی ہے۔ اقبال نے اسرارخودی میں بوعلی شاہ قلندر کے ایک مرید کا قصہ رقم کیا ہے کہ ان کا ایک مرید دہلی گھومنے آیا اور نیچے سر جھکائے مراقبہ کے عالم میں چلا جارہا تھا یہاں بادشاہ کی سواری نکل رہی تھی۔ چوب دار نے آواز دی کہ راستہ چھوڑ دو سواری نکل رہی ہے۔ وہ نہ سمجھا کہ کیسی سواری۔ اس پر چوب دار نے اس کے سر پر ڈنڈا مارا جس سے اس کا سر پھوٹ گیا خون بہہ نکلا وہ خون بہتا سر لے کر الٹے پاؤں اپنے پیر کے پاس پہنچا اور پھوٹا ہوا سر ان کی گود میں رکھ دیا۔ قلندر کو جلال آ گیا اور کہا کہ بادشاہ کا تختہ پلٹ دیا جائے گا۔ یہ خبر دہلی پہنچی تو بادشاہ اجلاس میں تھا۔ تھر تھر کانپنے لگا اور چہرہ زرد پڑ گیا۔ پھر اُس نے قرآن پڑھنے کو کہا تو قاری نے **ألا بذکر اللّٰہ تطمئن القلوب** پڑھی۔ اس بادشاہ کو ذرا ہوش آیا تو انھوں نے امیر خسرو کو معافی نامہ لے کر پانی پت بھیجا اور اس طرح اس کی خطا معاف ہوئی۔

نہ تاج وتخت میں نے لشکر وسپاہ میں ہے جو بات مرد قلندر کی بارگاہ میں ہے

جب مرد مومن درویشی یا قلندری کے درجہ کو پہنچ جاتا ہے تو اس کی رضا رضائے الٰہی میں شامل ہوجاتی ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنا سارا اثاثہ حضورِ رسالت مآبؐ میں لے آئے تو وحی نازل ہوئی کہ پوچھو ہمارا بندہ کیا چاہتا ہے۔ اقبال نے لکھا ہے:

خودی کو کر بلند اتنا کہ ہر تقدیر سے پہلے خدا بندے سے خود پوچھے بتا تیری رضا کیا ہے

یہ وہ مقام اور مرتبہ ہے کہ مٹی کے بستر پر لیٹنے والا روز وشب کی گردش کو تبدیل کر دیتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علیؓ سے ٹیک لگا کر سو گئے عصر کا وقت تھا سورج غروب ہوگیا۔ حضرت علیؓ کے آنسو ٹپکے تو رسول خدا نے پوچھا کیا ہوا تو انھوں نے بتایا کہ عصر کی نماز نہیں پڑھی اور سورج غروب ہوگیا تو رسولِ خدا نے دعا کی کہ اے اللہ اس کی نماز ادا ہوجائے عصر کا وقت دوبارہ پیدا کر تو سورج مغرب سے دوبارہ واپس آ گیا اور عصر کا وقت ہوگیا پھر حضرت علیؓ نے نماز ادا کی:

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

علامہ اقبال کہتے ہیں:

یقیں پیدا کر اے غافل یقیں سے ہاتھ آتی ہے وہ درویشی کہ جس کے سامنے جھکتی ہے فغفوری
خودی کی جلوتوں میں مصطفائی خودی کو خلوتوں میں کبریائی
زمین و آسماں کرسی و عرش خودی کی زد میں ہے ساری خدائی

○○

علی احمد فاطمی

اقبال اور جوش

بلا شک وشبہ بیسویں صدی کے اردو کے سب سے بڑے شاعر علامہ اقبال ہیں۔

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ بیسویں صدی میں ہی اقبال کے بعد اردو نظم کے حوالے سے جوش کی عظمت کا اعتراف کیا جاتا ہے۔ جوش پر بھی خوب کتابیں لکھی گئی ہیں، لیکن ایک خیال ہے کہ اردو میں جس شاعر پر سب سے زیادہ کتابیں لکھی گئی ہیں وہ اقبال ہیں۔

لیکن مقامِ حیرت ہے کہ ان دونوں پر لکھی گئی بے شمار کتابوں، مقالوں وغیرہ میں اقبال اور جوش کے مابین مماثلتوں اور فکری رشتوں پر کم سے کم لکھا گیا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ دنوں کو ایک دوسرے کا حلیف کم حریف زیادہ سمجھا گیا۔ قریب کم دور زیادہ سمجھا گیا۔ فکری و نظریاتی اعتبار سے بُعد اور ضد سمجھا گیا۔ ہر بڑے شاعر کی کچھ اساسی فکر ہوتی ہے۔ اقبال کی فکر کا بڑا حصہ اسلامی فلسفہ سے متاثر تھا اور جوش کو عام طور پر غیر اسلامی، غیر مذہبی یہاں تک کہ بعض لوگ دہریہ بھی کہتے تھے۔ کچھ نقادوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اقبال فلسفہ کے شاعر تھے اور جوش فطرت کے۔ اقبال عشق پر یقین رکھتے تھے اور جوش عقل پر۔ اقبال آسمانی باتیں زیادہ کرتے ہیں اور جوش زمینی۔ اقبال گہرے سمندر تھے اور جوش بہتے ہوئے جھرنے کی طرح تھے۔ ایک فرق کو پروفیسر محمد منور نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ''فرق نظریاتی ہے۔ علامہ اقبال ہندی قوم اور اسلامی جبلّت کے چشم و چراغ ہیں اور جوش ہندی قوم و اشتراکی ملّت کے نورِ نظر.....'' (علامہ اقبال جوش ملیح آبادی کی نظر میں)

انھیں کمزور صورتوں کی وجہ سے جوش شاعرِ انقلاب کہلائے اور اقبال شاعرِ اسلام۔

حالانکہ یہ فیصلے عجلت کے ہیں اور طے شدہ ذہن کے ساتھ وجود میں آئے ہیں۔ ایماندارانہ تجزیہ کیا جائے تو ان دونوں سے متعلق بعض فیصلے غلط ثابت ہو سکتے ہیں۔ یہ غلطیاں کیوں راہ پا گئیں، اس کے ذمہ دار

شاید خود جوش اور عہدِ جوش ہیں۔ جوش نے اقبال کی شخصیت وشاعری پر اعتراضات کئے اور خوب کئے۔ ان کے ''سر'' کے خطاب اور خطبۂ الہ آباد کو لے کر تو تھے ہی نیز ان کے خیالات سے بھی اختلافات تھے۔ بہر حال بات بننے کے بجائے بگڑتی ہی رہی۔ علامہ تو خیر سینئر تھے، بزرگ وبُردبار بھی۔ وہ خُردوں کو نہ صرف معاف کرتے بلکہ اکثر شفقت ومحبت سے نوازتے بھی تھے۔ خود جوش کا جب پہلا شعری مجموعہ ''روح ادب'' (۱۹۲۰ء) شائع ہوا تو علامہ نے جوش کو ہی لکھے ایک خط میں اس مجموعہ کی بعض نظموں کی تعریف کی جس کا ذکر آگے آسکتا ہے۔ اس مجموعہ کی تعریف میں مولوی عبدالحلیم شرر نے ''دلگداز'' میں تبصرہ بھی شائع کیا اور اکبر الہ آبادی کی تو ایک صفحہ کی تقریظ بھی ''روحِ ادب'' میں شاملِ اشاعت ہے۔

ان تمہیدی تحریروں کے ذریعہ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ عام طور پر جوش کو اقبال کے مخالفوں میں شمار کیا جاتا رہا ہے جو غلط بھی نہیں ہے، اس لیے جوش اکثر تحریر وتقریر اور ذاتی قسم کی محفلوں میں مخالفانہ نوعیت کی گفتگو کرتے رہے ہیں جس سے عقیدت مندانِ اقبال جوش وجذبہ میں اپنے شدید ردّعمل کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ رفتہ رفتہ یہ ردّعمل یا جوابی کاروائی ایک مستحکم رائے کی شکل میں ڈھلتی گئی جس سے فضا مکدّر رہی ہوئی۔ معاصرانہ چشمک اور وقتی اُبال یا جواب کے تحت ایسا عمل اور ردّعمل فطری تو ہوتا ہے لیکن وقت کے ساتھ مدھم بھی ہوتا جاتا ہے اور فیصلہ کرتا ہے شاعر کا کلام اور کلام کے اندر پایا جانے والا فکر وشعور، احساس وادراک۔

یہ سچ ہے کہ جوش اقبال کے بعض تصورات سے اختلاف رکھتے تھے اور قوم کے ہاتھ میں ''کلام'' کے بجائے تلوار دینے پر یقین رکھتے تھے اور بلند آہنگی سے کہتے تھے ''قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے جاتا ہوں''۔ اور اقبال نے کہا ''ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ''۔ اگر یہ دونوں رُخ نہ ہوتے تو آگے چل کر علی سردار جعفری یہ نہ کہہ پاتے:

ان ہاتھوں کی تعظیم کرو
ان ہاتھوں کی تکریم کرو

ملاحظہ کیجئے کہ ان سب کے درمیان ''ہاتھ'' مشترک ہے۔ کام کرنے والا ہاتھ جو اقبال کے یہاں عمل، جوش کے یہاں نعرہ اور جعفری کے یہاں نظریہ بن جاتا ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے اسے محض اشتراکی تصور سے جوڑ کر دیکھا اور کچھ اقبال کے تشکیل کردہ حرکی نظام کے تناظر میں دیکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو تفکر وتواتر کے

یہ سلسلے شاعرانہ فکر کو جوڑتے ہیں، الگ نہیں کرتے۔ فکر کی یہ وسعت اور لاشعوری ردّ وقبول کی صورتیں ظاہری کچھ اور ہوتی ہیں اور باطنی کچھ اور۔ اقبال کی عظمت سے کسے انکار لیکن یہ عظمت صرف ان کی شاعری کی چہار دیواری تک تو محدود نہیں۔ بامقصد اور بامعنی بڑی شاعری اپنے زمانے میں بھی اور بعدِ زمانہ بھی رنگ وبُو پھیلاتی ہے اور نو نہالوں کی جڑوں کو سرسبز وشاداب کرتی ہوئی چمن میں بہار کی طرح چھا جاتی ہے۔ شاعری کی اصطلاح میں اسے صرف تقلید نہیں کہا جاسکتا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اقبال کی تعمیر کی ہوئی ذہنی وفکری دنیا سے کیا کیا رنگ پھوٹتے ہیں، کیسی خوشبو پھیلتی ہے اور کس جگہ اور کس انداز سے رچ بس جاتی ہے اگر یہ تلاش نہ کیا جائے تو نہ تحقیق وتنقید کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ تخلیق کا۔ ہر بڑا شاعر جو مفکر بھی ہوتا ہے اور اپنے پیش روؤں سے متاثر بھی ہوتا ہے اور کبھی کبھی ان بڑوں کو سوال کے کٹہرے میں کھڑا بھی کرتا ہے۔ یہ سوال بھی اس کی عظمت کی دلیل ہوا کرتی ہے۔ اقبال نے اکثر بڑوں پر سوالات اُٹھائے ہیں، اس لیے جوش اگر اقبال پر سوال کرتے ہیں یا اعتراض کرتے ہیں تو یہ بھی بقول اقبال حیدر:

> ''یہ بھی عظمتِ اقبال کا کُھلا اعتراف ہے۔ یوں بھی جبلّی طور پر ہر
> عظمت اپنے سے فوری پیشتر عظمت کا ثمر ہوتے ہوئے اس سے
> تجاوز کرنے کی بھی خواہاں ہوتی یہ Self Assetration اور
> Self Activization کے لیے لازمی ہے۔''
>
> (بقدر ذوقِ نگاہ)

ہم مدّتوں تفکرِ اقبال میں تو سرگرداں رہے لیکن تسلسلِ اقبال پر توجہ نہ دے سکے یعنی وہ سلسلہ جو اقبال کے بعد دیگر اہم شعراء جن میں جوش بھی شامل ہیں، اقبال کے کلام کے شعوری یا لاشعوری اثرات سے بچ نہیں سکے تھے جس کا کچھ اعتراف کرتے ہیں اور کچھ اعتراض۔ لیکن اثر دونوں کے یہاں ہے۔ بس اسی کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔

۱۹۸۴ء میں اقبال اکادمی، پاکستان میں ۸۴ء میں اقبال پر لکھے گئے مضامین کا ایک انتخاب شائع ہوا تھا جسے ڈاکٹر وحید عشرت نے ترتیب دیا تھا۔ اس میں جگن ناتھ آزاد کا ایک مضمون ہے ''اقبال اور جوش''۔ راقم نے بغور اس کا مطالعہ کیا۔ آزاد کا خیال عجیب ضرور ہے لیکن بڑی حد تک درست ہے کہ جوش جب تک سیکولر

ہندوستان میں رہے خوب مقبول رہے، لیکن جیسے ہی وہ اسلامی ریاست پاکستان چلے گئے ان کی شہرت کا گراف گرتا چلا گیا اور اسے گرنا ہی تھا۔ اسی درمیان بقول آزاد ''ہندوستان میں اقبال کا احیاء شروع ہوا اور ۷۷ء بلکہ ۷۳ء تک آتے آتے ہندوستان کی فضا اقبال کے نام اور کلام سے ہوگئی۔'' پاکستان میں جوش کی غیر مقبولیت اور ہندوستان میں اقبال کی مقبولیت کے کیا مخفی اور ظاہری اسباب ہو سکتے ہیں، اس پر عمدہ گفتگو ہو سکتی ہے۔ پاکستان میں تو اقبال کا ڈنکا بجا ہی ادارے وغیرہ قائم ہوئے اور انھیں شاعرِ اسلام کے ساتھ ساتھ بانیٔ پاکستان وغیرہ کے القاب سے نوازا گیا۔ اسی لیے وہ شاعرِ پاکستان یعنی قومی شاعر کہلائے۔ ملاحظہ کیجئے کہ ایک عالمِ انسانیت کے شاعر کو محض شاعرِ پاکستان کہا جانا کس قدر مناسب ہے؟ خیر یہ بھی ایک الگ بحث ہے۔ بہر حال ان دونوں ملکوں میں اور ملکوں سے باہر اقبال کے حوالے سے خوب خوب کام ہوئے اور آج بھی ہو رہے ہیں۔ اقبال اور قرآن اور اقبال اور اسلام کے علاوہ اقبال اور رومی، اقبال اور گوئٹے، اقبال اور غالب، اقبال اور اکبر، اقبال اور پریم چند یہاں تک کہ اقبال اور فراق، اقبال اور جمیل مظہری پر مضامین لکھے جاتے رہے۔ (ملاحظہ کیجئے ڈاکٹر تسکینہ فاضل کی کتاب ''اقبال اور ان کے معاصر شعراء و ادباء'') اور بعض دوسری کتابیں بھی۔ لیکن اقبال اور جوش کے رشتوں پر مضامین نہیں ملتے ہیں۔ خود جگن ناتھ آزاد نے بھی نہیں سوچا، جب کہ وہ جوش کے اور ان کے والد تِلوک چند محروم اقبال کے بہت قریب رہے ہیں اور آزاد نے بھی بچپن میں اقبال سے شفقت حاصل کی۔ یہ مضمون بھی آل احمد سرور کی فرمائش پر لکھا۔ وہ خود لکھتے ہیں:

> ''چند برس قبل پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر نیّر مسعود، ڈاکٹر حامدی کاشمیری نے مجھ سے فرمائش کی کہ میں ''اقبال اور جوش'' کے عنوان سے ایک مقال لکھوں تو مجھے حیرت سے زیادہ مسرّت ہوئی اور نظیری کا یہ مصرع زبان پر آ گیا۔
>
> ''پس از مدّت گذر بر ما کاروانے را''۔

آزاد صاحب کو اقبال اور جوش کے رشتوں پر مضمون لکھتے ہوئے دقّت کا سامنا ہوا۔ ان کو اس بات کی خوشی تو ہے کہ جوش کا نام اقبال کے ساتھ جوڑا جا رہا ہے، وہ بھی اس لیے کہ ان کا خیال ہے کہ ''جوش کی شاعری کی ہمارے نقادوں نے وہ داد نہیں دی جس کی کہ یہ مستحق ہے۔'' ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ''دونوں کو ملا کر گفتگو کی

جائے گی تو جوش کے ساتھ انصاف نہ ہو سکے گا۔'' شاید اس کے لیے دونوں شاعروں کا رنگ و آہنگ الگ الگ ہے اور سچ یہ ہے کہ مرتبہ بھی الگ ہے۔ غالباً اسی لیے وہ کہتے ہیں کہ ''جوش کی شاعری پر لکھنے کے لیے ضروری ہے کہ صرف جوش کی ہی شاعری پر لکھا جائے۔'' اس لیے کہ جب مرتبہ وعظمت کا معاملہ ہوگا تو اقبال بلا شک وشبہ ایسی عظمت و بلندی پر بیٹھے ہوئے ہیں جس کا اعتراف خود جوش کرتے ہیں:

''مجھے اس کے (اقبال کے) شاعرانہ کمال اور مفکرانہ عظمت سے
کب انکار تھا۔ اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔''
(اقبال کی موت)

اقبال ہر اعتبار سے جوش سے بڑے تھے۔ عمر میں، علم میں، فکر میں اور فلسفہ میں۔ اس لیے اقبال کا جوش سے متاثر ہونا ممکن نہ تھا سوا اس کے کہ ''روحِ ادب'' کی اشاعت پر ایک خط بطور تعریف لکھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ جوش فکری اعتبار سے اقبال سے کس قدر متاثر اور ان کی فکرِ رسا اور اپنی فکرِ طبع کے انسلاک اور امتزاج سے کس قدر مختلف تھے یا اس کی توسیع تھے یا کچھ اور۔ یہ ایک اہم سوال ہے جسے جگن ناتھ آزاد نے بھی یہ کہہ کر اُٹھایا ''جوش اقبال سے متاثر ہوئے یا نہیں؟'' یہ کلامِ جوش کے مطالعے کا ایک اہم سوال ہے۔ آزاد نے واضح طور پر لکھا:

''جوش صاحب کے منہ سے اقبال کی شاعری کے متعلق کبھی جملۂ
خیر نہیں سنا..... جوش صاحب کو اقبال کی شاعری پسند تھی نہ
نثر۔''

آزاد کیا خود جوش صاحب نے بھی بعد وفات خراج پیش کرتے ہوئے جہاں ان کی عظمت کا اعتراف کیا وہیں پوری صفائی سے یہ بھی کہا:

''ہر چند کہ مجھے اس کے خیالات سے اختلاف تھا، مجھے اس کی
روش اور دائرہ عمل سے شدید اختلاف تھا۔ ابتدا میں اس کی شاعری
وسیع اور آفاقی تھی مگر بعض وجوہ کی بنا پر اس کی شاعری کا دائرہ تنگ
ہونے لگا اور آخر کار یہاں تک تنگ ہو گیا کہ اس کی تمام تر شاعری
مذہب تک محدود ہو گئی۔''

آزاد صاحب نے ان کے ایک انٹرویو کے حوالے دیے ہیں جس میں ایک جگہ وہ اقبال کے بارے میں کہتے ہیں:

''میرے نزدیک قدرت نے ان کو (اقبال کو) ایک سمندر بنایا تھا۔ وہ کوشش کر کے ایک دریا میں تبدیل ہو گئے۔ قدرت نے ان کو آفاقی شاعری کے لیے بنایا تھا، وہ اسلامی شاعری پر اتر آئے۔ وہ قطبین کو چھو سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے آپ کو محدود کر لیا عرب اور حجاز میں۔''

(اقبال اور جوش از جگن ناتھ آزاد۔ اقبال ۸۴ء اقبال اکادمی، پاکستان)

لیکن ساتھ ہی جوش یہ بھی کہتے ہیں:

''لیکن ان تمام باتوں کے باوجود کس کے منھ میں اتنے دانت ہیں کہ وہ ان کی عظمت کا انکار کرے۔ اقبال عظیم اور عظیم شاعر۔ اقبال مفکر تھا اور عظیم مفکر۔'' (اقبال کی موت)

بڑے شاعروں کی بڑی بڑی باتوں کے عجب انداز ہوا کرتے ہیں جنھیں ہمارے نقادانِ ادب اپنی پسند یا ناپسند اور سمجھ کی ترازو پر ناپتے تولتے ہیں جس سے اکثر خلط مبحث اور غلط قسم کے نتائج برآمد ہوتے ہیں، جن سے گمراہیاں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر بڑے شاعر کے یہاں تضادات ملتے ہیں۔ فکر و خیال کے تضادات دراصل زندگی کے تصادمات سے جنم لیتے ہیں۔ ایک عجیب سا کراس (Cross) قائم ہوتا ہے لیکن یہی کراس ہی بڑی فکر اور فکر یہ شاعری کو جنم دیتا ہے اور اپنی افتادِ طبع کے تحت اپنے اپنے راستے خود اختیار کرتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ جوش صرف فطرت کے اور اقبال صرف فلسفہ کے شاعر تھے مناسب نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اقبال کو بھی فطرت سے لگاؤ تھا۔ ان کی ابتدائی دور کی نظموں (چاند، جگنو، ایک شام، صبح کا ستارہ، نمودِ صبح، خضرِ راہ اور ساقی نامہ وغیرہ) کے اثر انگیز حصے اس کی گواہی دیتے ہیں۔ اسی طرح جوش کی شاعری میں فطرت کے ساتھ ساتھ فلسفیانہ رجحانات بھی مل جاتے ہیں۔ آپ ان کی نظمیں ''فریبِ ہستی'' ''آدمی نامہ'' ''نوحۂ آگاہی'' ''آدم کا نزول'' اور ''الہام و افکار'' کی بیشتر نظمیں اور ''نجوم و جواہر'' کی بیشتر رباعیاں اس کے ثبوت فراہم کرتی

ہیں لیکن ان کی اپنی اپنی ترجیحات ہیں۔اسی لیے کہا جاتا ہے کہ جوش کے یہاں فلسفہ، جذبہ کے حوالے سے آتا ہے اور اقبال کا فلسفہ سراپا فکر وحکمت میں غرق ہو جاتا ہے، لیکن عقل وعمل سے الگ نہیں ہوتا۔ جوش کے یہاں فلسفہ ان کی آزاد طبیعت اور تلون مزاجی کی وجہ سے ان کی فطرتِ ثانیہ کا حصہ کبھی نہ ہو سکا۔ جب کہ اقبال فطرت کو بھی فلسفہ کے روپ میں پیش کر کے اپنی سنجیدہ، متین شخصیت کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ ان کی وجدانی دریافت تھی۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''میری زندگی کا بیشتر حصہ فلسفے کے مطالعے میں صرف ہوا اور یہ نقطۂ نگاہ
میری فطرتِ ثانیہ بن گیا ہے۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر میں اسلام
کے حقائق اور صداقتوں کا مطالعہ اسی نقطۂ نگاہ سے کرتا ہوں۔''

ایسا نہ تھا کہ جوش فلسفہ کا مطالعہ نہ کرتے تھے۔ وہ اکثر دنیا کے بڑے فلسفیوں کی کتاب پڑھتے تھے لیکن فلسفہ اقبال کی طرح ان کے فکر کا لازم عنصر یا بڑا عنصر کم بن سکا۔ یہ کوئی عیب کی بات نہیں لیکن جوش صاحب کی کچھ اپنی نفسیاتی گرہیں تھیں جو اقبال کے حوالے سے اکثر کھُل جایا کرتی تھیں۔ اس لیے اکثر وہ اقبال پر اعتراض کر جاتے لیکن ان کے اعتراضات سے نہ جوش کی بڑائی کم ہوتی ہے اور نہ اقبال کی عظمت پر حرف آتا ہے۔ ایک ہی عہد کے دو بڑے شاعروں کے مابین ایسے مباحث کا در آنا فکری بھی ہوتا ہے اور فطری بھی۔ جوش کے یہاں الفاظ کا پھیلاؤ ہے وہ وحدت میں کثرت دیکھتے ہیں اور اقبال کثرت میں وحدت دیکھتے ہیں۔ یوں بھی شعر میں فلسفہ کا اظہار ایجاز واختصار کے قریب زیادہ جاتا ہے۔ جوش کے یہاں ایجاز واختصار برائے نام ہے۔ وہ اعتراف کرتے تھے اور کہتے تھے ''ہاں یہ ہمارا خاص فن ہے۔'' اس کے پیچھے منطق یہ تھی کہ فلسفیانہ موضوع کو دلکش بنانے کے لیے اسے طرح طرح سے بیان کیا جائے۔ وہ انیس کے اس مصرع کے قائل تھے ''اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں''۔ اسی لیے وہ میر، غالب کے بجائے خیّام اور نظیر کے بیحد قائل تھے۔

اقبال کے قلب میں فلسفہ تھا، جو ان کے رگ وریشے میں سمایا ہوا تھا۔ کہتے ہیں۔

ہے فلسفہ میرے آب و گِل میں
پوشیدہ ہے ریشہ ہائے دل میں

جوش فلسفہ کو زندگی کے مظاہر میں تلاش کرتے ہیں پھر اسے ایسے لفظی جامہ پہناتے ہیں کہ بظاہر ایسا لگتا ہے کہ وہ

فلسفہ سے دور کلچر کے قریب آ رہے ہیں۔ یہ رباعی دیکھئے۔

اللہ رے خواہشوں کا اندھا طوفاں
حسرت، ہُلّڑ، ہراس، چنچل ہیجاں
اُمڈے ہوئے جذبات میں پیغامِ فنا
جب تک کہ نہ ہوں عقل کے زیرِ فرماں

جوش کی دو رباعیاں اور دیکھئے۔

آوارہ کو آسودہ منزل کر دو
نادان کو داناؤں میں شامل کر دو
در پر آیا ہے وحی لے کر جبرئیل
خدّام خود اس پہ وحی نازل کر دو

☆

کل رات گئے عینِ طرب کے ہنگام
پرتو یہ پڑا پشت پہ کس کا سرِ جام
تم کون ہو، جبرئیل ہوں، کیوں آئے ہو
سرکار فلک کے نام کوئی پیغام

ان رباعیات کے بارے میں جگن ناتھ آزاد کے خیالات ملاحظہ کیجئے:

''ان رباعیات کے مصرعوں کا آہنگ، الفاظ کا در و بست، ان میں نغمگی کی کیفیت ماورائے تعریف ہے لیکن نہ جانے کیا بات ہے کہ جب بھی یہ اور جوش صاحب کا اس طرح کا کلام میری نظر سے گذرتا ہے، میرا ذہن بے اختیار اقبال کے اس شعر کی جانب منتقل ہو جاتا ہے۔

قیدِ دستور سے بالا ہے مگر دل میرا
فرش سے شعر ہوا عرش پہ نازل میرا

یہ چند مثالیں دے کر میں یہ کہنے کی کوشش نہیں کر رہا ہوں کہ جوش اقبال کے خوشہ چیں ہیں، کہنا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر چہ جوش، فکرِ اقبال کو ہدفِ تنقید بناتے ہیں لیکن دونوں کے یہاں فکری ہم آہنگی اگر ہم تلاش کریں تو اس کی مثالیں ہمیں مل سکتی ہیں اور اقبال پر تنقید کے باوجود جوش اقبال کے اثر سے آزاد نہیں ہیں۔''

انتخابِ جوش کے دیباچہ میں احتشام حسین نے بھی لکھا ہے:

''شدّتِ جذبات اور سریع الحسی نے جوش میں بہت سے متضاد عناصر پیدا کر دیے ہیں۔ اور چونکہ وہ سب باتیں ان کی شاعری اور گفتگو میں نمایاں جگہ پا چکی ہیں اس لیے جوش ان سے دستبردار بھی نہیں ہوتے گو تفکر انھیں بچپن سے عزیز رہا ہے اور انھوں نے اسے سینے سے لگائے رکھا ہے لیکن ان کا ذہن طبعاً جذباتی ہے، منطقی نہیں ہے۔ ان کی منطق بھی جذبات کی گود میں پرورش پاتی ہے۔ مذہب، خدا، حیات موت، جبر و اختیار، مقصدِ حیات علم انسانی، عقل و عشق، جنون و حکمت ان تمام مسائل پر انھوں نے غور کیا ہے اور حسین ترین شاعرانہ انداز میں ان کے نازک مقامات کو پیش کیا ہے لیکن ہر مقام پر عقل و جذبہ کی آویزش اتنی شدید رہی ہے کہ مفکر جوش کو شاعر جوش نے اکثر شکست دے دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک طرف مطلق جبر کے قائل ہیں اور دوسری طرف انسان کو عمل پر اُکسا کر اسے خدا بنانے اور کائنات کی تشکیل کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ دونوں باتیں جبر کے تحت ہو رہی ہیں۔''

جگن ناتھ آزاد نے ایک اور بڑے پتے کی بات کہی ہے:

''جوش کا غنچۂ فکر محض نفس کے زور سے وا ہوا۔ آفتاب کا پرتو اس
کے نصیب میں نہیں تھا۔ خدا جانے انھیں اپنی اس کوتاہی کا احساس
تھا یا نہیں لیکن انھوں نے اپنے کلام میں فکری عناصر کی کمی شکوہ
الفاظ سے پورا کرنے کی کوشش کی۔''

جنھوں نے ''نجوم و جواہر'' کی رباعیاں اور ''الہام و افکار'' کی نظمیں پڑھی ہیں، انھیں آزاد کے ان خیالات سے اختلاف ہوسکتا ہے تاہم اس حقیقت سے انکار نہیں کہ جوش کی جذباتیت اور سریع الحسی نے فلسفہ کے کساؤ کو نظم کے پھیلاؤ میں بدل دیا اور پھر اس پھیلاؤ میں متعدد عناصر شامل ہوتے گئے جو اصل فلسفہ کو کہیں کلچر، کہیں منظر اور کہیں دلبر میں تحلیل کرتے گئے جب کہ فلسفۂ اقبال اس طرح کے بکھراؤ سے پاک ہے لیکن یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ اقبال کے یہاں اسلوب کی رنگارنگی اور موضوعات کا تنوع جوش کے مقابلے نسبتاً کم نظر آتا ہے۔ اسلوب کے جتنے شیڈس آپ کو جوش کے یہاں ملیں گے اتنے اقبال کے یہاں نہیں نظر آئیں گے اور بڑے شاعر کی چند خوبیوں میں ایک بڑی خوبی شش اسلوبی (Multi-Dictional) ہونا ہے لیکن یہ بھی ہے کہ اسلوب کی دلکشی اور تہہ داری بھی فکر کے بغیر استحکام نہیں پاتی۔ کوئی بھی شاعر حکیمانہ موضوعات اور فلسفیانہ رجحان کے بغیر بڑا نہیں ہوتا۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر شاعر کا مخصوص و منفرد لہجہ، انداز اور اسلوب ہوتا ہے۔ کنیڈین پروفیسر نارتھاپ فرائی (Northop Frye) نے اپنی کتاب The Well Tempered Critic میں ایک جگہ لکھا ہے:

"For the genuine and sincere writer, every thing he writes in high style he means every line with the maximum of intensity and is opt to become exasperated with redaers whose reception of his work is tepid or selective."

(The well tempered critic)

اب ذرا تصویر کے دوسرے رُخ کو نزدیک سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم اکثر جوش اور اقبال کے اختلافی اور

کمزور پہلوؤں پر گفتگو کرنے آئے ہیں لیکن اتفاقی اور انحرافی پہلوؤں کو بھی بغور سمجھنے کی ضرورت ہے۔

کنیڈا میں ہی مقیم اردو کے ممتاز شاعر و ادیب اقبال حیدر جو جوش پر گہری نظر رکھتے ہیں اور ان کی کتاب ''نادیدنی ہوں جوش'' (۲۰۱۷ء) کو میں جوش پر لکھی گئی چند اچھی کتابوں میں شمار کرتا ہوں۔ انھوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا:

> ''میر اور سودا کا ہندوستان بدل چکا تھا۔ سرسید اور غالب اپنے اپنے انداز میں روشن خیالی اور خرد افروزی کی تعلیم دے رہے تھے۔ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سرسید اور غالب کے بعد حالی اور ان کے بعد اکبر و اقبال آئے۔ پھر اسی سلسلے کی ایک اور کڑی فراق و جوش کی شکل میں نظر آئی۔ ایک طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ سرسید سے شروع ہونے والی مخصوص فکر کا نقطۂ کمال اور خطِ عروج اقبال تھے اور غالب سے شروع ہونے والی فکرِ اقبال کے حرکی فلسفے کا اثر قبول کرنے کے بعد جس منطقی رویّے سے آشنا ہونے جا رہی تھی اس کا جوہر اصل اتباع میں نہیں تجاوز میں مضمر تھا۔ ہند و پاک کی تقسیم کے وقت مروّجہ نظامِ فکر اور منقولہ طرزِ معاشرت کا سب سے بڑا تجدیدی حوالہ اقبال تھے تو متجاوز نظامِ فکر اور متبادل طرزِ معاشرت کا ایک اہم موڑ جوش تھے۔'' (رودبارِ انحراف)

اتباع اور تجاوز کے فرق کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی طرح تقلید اور تجدید کے فرق کو بھی سمجھنا ضروری ہے۔ جوش کی یہ ذہانت تھی کہ انھوں نے اتباع سے زیادہ تجاوز کا راستہ اختیار کیا جو ضروری تھا۔ اس لیے اقبال فکر و فلسفہ اور شاعری کی جس بلندی پر پہنچ گئے تھے وہاں نہ جانے کتنے معصوم شعراء تقلیدی عمل سے گذرے اور گُم ہو گئے لیکن جوش کی انحرافی طبیعت نے تجاوز اور تخالف سے کام لیا اور الگ پہچان بنائی جو عہدِ اقبال یا حیاتِ اقبال میں ایک بیحد مشکل کام تھا۔ لیکن یہ انحراف اور علیٰحدہ شناخت دو مختلف و متضاد راستے نہیں بناتی بلکہ دیکھا جائے تو ایک ہی راستے کی مختلف شاخیں اور راہیں ہیں۔ لیکن یہ راستہ ہی اپنے آپ میں اس قدر چوڑا چکلا ہے کہ اس پر چلتے

ہوئے مسافرانِ سفر الگ الگ سے دکھائی ضرور دیتے ہیں جو مختلف شناخت اور جہت کے لیے ضروری بھی ہے لیکن بغور دیکھا جائے تو ان کی منزلِ مقصود ایک ہی ہے۔ بالخصوص جوش کی۔ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے:

''اقبال کے علاوہ اردو کے کسی شاعر نے اپنے علم کو فروغ دینے اور
فکر کو مہمیز کرنے پر اتنی توجہ اور محنت نہیں کی جتنی کی جوش نے کی۔''

اس کی مثالیں جوش کی شاعری میں مل جائیں گی۔ جب اقبال کہتے ہیں ''جو روح کو تڑپا دے جو قلب کو گرما دے'' جوش کی شاعری کا بڑا حصہ اقبال کے اس مصرع پر اُترتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اقبال کے یہاں یہ تڑپ اور گرمی فلسفہ کا لبادہ اوڑھ لیتی ہے اور جوش کے یہاں جذبہ اور کہیں کہیں نعرہ کا روپ اختیار کر لیتی ہے لیکن یہ جذبہ، یہ نعرہ یہاں تک کہ انقلاب کا لفظ بھی جوش سے منسوب (میرا نعرہ انقلاب و انقلاب و انقلاب) ہوتے ہوئے بھی اقبال سے بالواسطہ یا بلا واسطہ اثر قبول کرتا ہے۔ علی سردار جعفری نے اقبال شناسی میں صاف طور پر لکھا ہے کہ ''انقلاب'' کا لفظ سیاسی معنوں میں سب سے پہلے اقبال کے یہاں ملتا ہے۔ ان کی فارسی نظم کے یہ دو تین بند دیکھئے۔

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعل ناب
از جفائے دہ خدا یا کشت دہقانِ خراب
انقلاب، انقلاب اے انقلاب

☆

شیخ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنار آب
انقلاب، انقلاب اے انقلاب

☆

واعظ اندر مسجد و فرزند او درمدرسہ
آں بہ پہری کود کے ایں پیر درِ عہدِ شباب
انقلاب، انقلاب اے انقلاب

☆

با ضعیفاں گاہ نیروئے پلنگاں می دہند
شعلہ شاید بروں آید زفانوسی حباب
انقلاب، انقلاب اے انقلاب

اس کے علاوہ بندگی نامہ، جاوید نامہ اور ساقی نامہ کے بعض مصرعے بھی نظر میں رکھے جاسکتے ہیں۔

جوش نے اس لفظ کو کچھ ایسا عملی و تخلیقی جامہ پہنایا ہے کہ شاعرِ انقلاب کے طور پر مشہور ہوئے۔ حالانکہ ان کے اس لقب نے ان کو نقصان زیادہ فائدہ کم پہنچایا۔ سردار جعفری نے غلط نہیں لکھا:

''جوش کا صحیح ادبی مقام سمجھنے میں سب سے بڑی غلطی 'شاعرِ انقلاب' کے لقب کی وجہ سے ہوئی ہے۔ انقلاب کا لفظ نقادوں کو غلط راستے پر ڈال دیتا ہے اور انقلاب اور رومان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دیتا ہے۔''

(ترقی پسند ادب)

اور جو اقبال کے بارے میں لکھا وہ زیادہ غور طلب ہے:

''انقلاب کا لفظ سیاسی اور سماجی تبدیلی کے معنوں میں سب سے پہلے اقبال نے استعمال کیا اور سیاسی انقلاب کا تصور بھی اردو شاعری کو اقبال ہی نے عطا کیا۔ سرمایہ دار اور مزدور، زمیندار اور کسان، آقا اور غلام، حاکم اور محکوم کی باہمی کشمکش کے موضوعات پر سب سے پہلے اقبال نے نظمیں کہیں لیکن اس کے بعد شاعرِ انقلاب کے خطاب کا حقدار جوش کو سمجھا گیا۔''

(ترقی پسند ادب)

یہ ایک اہم سوال ہوسکتا ہے لیکن اس کا جواب بھی خود سردار جعفری نے یہ کہہ کر دیا کہ اقبال نے براہِ راست سیاسی جدوجہد پر نظمیں کم کہیں اور جو کہیں اسے فلسفۂ خودی میں ڈھال دیا جو براہِ راست انقلابی عمل سے قدرے دور چلا جاتا ہے اور جوش نے براہ راست پورے تخاطب اور جوش و ولولہ کے ساتھ ایجی ٹیشنل نظمیں کہیں۔ ایسی

خطابیہ نظموں میں عموماً بلند آہنگی اس کا وصف سمجھی جاتی ہے لیکن اردو کے خاموش وسنجیدہ شاعروں اور نقادوں نے اسے عیب سمجھ کر معمولی نظمیں قرار دیں۔ وہ یہ بھول گئے کہ ہر نوع کی شاعری کی شعریات مختلف ہوا کرتی ہے۔ ایک ہی شعریات سے سب کو ہانک دینے کی وجہ سے ایک جوش کیا، ہم سودا، نظیر، انیس، اکبر، چکبست، اسمٰعیل میرٹھی جیسے مختلف رنگا رنگ اور اہم شاعروں کے ساتھ انصاف نہیں کر پائے۔ یہ بھی ایک قسم کی بحث ہے جسے میں یہاں چھوڑتا ہوں۔ لیکن اس پر گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

یہ الگ بات ہے کہ جوش کی ان ایجی ٹیشنل نظموں میں بھی انقلاب کم رومان زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ بھی غالباً یہی ہے کہ جوش کے انقلاب کا تصور ہی رومانی ہے۔ لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ اپنی تمام تر مخصوص رومانیت اور جمالیاتی کیفیت کے باوجود جوش نے آزادی کے جو حسین و بلیغ مرقعے اردو شاعری میں پیش کئے وہ اردو شاعری میں اس سے قبل نہ تھے۔ اس نوع کی شاعری کی بنیاد اگر اقبال نے ڈالی تو جوش اور اس کے بعد فیض، علی سردار جعفری، مخدوم محی الدین، کیفی اعظمی وغیرہ نے اسے ایک بڑی عمارت میں تبدیل کر دیا۔ میں نے کہیں لکھا تھا پھر دہرا رہا ہوں کہ پوری ترقی پسند شاعری اقبال اور جوش کی مرہونِ منّت ہے۔ ان کی پشت پر ان دونوں شاعروں کے سایے ہیں۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ جوش کی اس مزاج کی شاعری میں صرف رومان ہی رومان ہے۔ ایک سوچ بھی ہے جو کبھی کبھی نظریہ میں ڈھلتی نظر آتی ہے۔ چند اشعار دیکھئے۔

نظر کا کلبۂ مزدور پر معمار فطرت کی
تلاطم میں ہے قصرِ آہنی سرمایہ داری کی
شہانِ کج کلہ پر تنگ ہے عالم کی پنہائی
درِ دہقاں پہ دستک دے رہی ہے شانِ دارائی
جہاں بانی دہکتی آگ ہے گرتی ہوئی بجلی
ہمیشہ اس نے دنیا میں کیا دورِ محن پیدا
ہزاروں تجربوں کے بعد اب انساں یہ سمجھا ہے
کہ شاہی سے نہیں ہوتا شرافت کا چلن پیدا
سُن اے غافل کہ تا روزِ قیامت نسل شاہی سے
نہ ہوگا بزمِ انسانی کا صدرِ انجمن پیدا

یہاں وہ اقبال کے بندۂ مزدور سے آگے بڑھتے نظر آتے ہیں، شاید اس لیے کہ زمانہ بھی آگے کا ہے۔ اقبال دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں (۱۹۳۸ء) اور جوش نے پوری تحریکِ آزادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اگر آپ مارکس، لینن آزادی، غلامی وغیرہ پر بھی بعض ملی جلی نظموں کو ملاحظہ کریں اگرچہ اسلوب، رویہ قدرے الگ الگ ضرور ہے لیکن جوش اور اقبال نفسِ مضمون، نفسِ خیال میں ایک دوسرے کے قریب نظر آتے ہیں۔

''اردو نظم پر اقبال کے اثرات'' کے مصنف ڈاکٹر مظہر حامد نے تو یہاں تک لکھ دیا:

> ''جوش کے ہاں صنائع بدائع، لفظی پیکر تراشنا، تراکیبِ لفظی کا بہترین استعمال ملتا ہے مثلاً نخلِ خوش حالی، مریضِ انسانیت، امرت گرم، آبِ بہرِ تشنگاں، خستگان بےنوا اور بندگانِ بےخدا وغیرہ ایسی تراکیبِ لفظی ہیں جو اقبال سے پہلے کی شاعری میں کہیں نہیں ہے۔ اقبال نے صنعت گری کا پورا انتظام رکھا ہے۔ صنعتِ مرعات النظیر، صنعتِ ترجیع، صنعتِ تلمیح، صنعتِ طباقِ ایجابی وغیرہ۔ اسی طرح جوش نے بھی اقبال کی فکر سے متاثر ہو کر اپنے شعری آہنگ کو نکھارنے کی کوشش کی ہے۔''

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

> ''جوش کی مجموعی نظمیں اور فکر و نشاط کی نظموں میں جو کچھ مواد ہمیں ملتا ہے ان میں عالم اور شاعر، دنیا اور شاعر، شاعر اور لیڈر، شاعر کا دل ان نظموں میں جوش نے ایک شاعر کو پیش کر کے خود اپنے اوصاف ظاہر کئے ہیں۔ وہ اس لیے کہ جوش شاعرِ انقلاب، شاعرِ شباب، شاعرِ خمریات اور شاعرِ فطرت کی حیثیت سے مشخص ہو چکے تھے۔ شعلہ و شبنم میں وہ مناظرِ فطرت پر کئی نظمیں ملتی ہیں جن سے تشبیہات اور استعارات کا مربوط نظام ملتا ہے۔ یہی اقبال کے اثرات کا اشاریہ ہیں۔ جوش کی یہ مثلّث دیکھئے۔

یہ شفق ہے یا فرازِ چرخ پر عکسِ چمن
یا تصور میں کسی گل پیرہن کا بانکپن
یا غریبِ خستہ جاں کے قلب میں یادِ وطن

''اس نظم میں تشبیہات کا جو نظام ہے وہ اقبال کی تشبیہات سے مماثل ہیں۔ جوش کی نظمیں جو فطرت پر ہیں ان میں مناظر سحت، تماشائے قدرت، برقِ عرفاں اور برسات کی شفق پر اقبال کی فکر کے اثرات واضح نظر آتے ہیں۔'' (اردو نظم پر اقبال کے اثرات۔ ص۲۵۲۔۲۵۱)

مثالیں اور ہیں، اور حوالے بھی اور لیکن مضمون کو ختم بھی کرنا ہے اس لیے اختتام پر میں اقبال کے اس خط کا ذکر کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو انھوں نے جوش کی بعض نظموں کی پسندیدگی کے تعلق سے جوش کو لکھا تھا۔ یہ واقعہ اس وقت کا ہے جب جوش کا پہلا شعری مجموعہ ''روحِ ادب'' (۱۹۲۰ء) شائع ہوا جس پر اکبر الہ آبادی کی ایک صفحہ کی تقریظ بھی شامل تھی۔ اس تقریظ کا ایک جملہ بیحد معنی خیز ہے۔ ملاحظہ کیجئے:

''اس وقت آپ کی طبیعت کا جو رنگ اس پر ایک ازلی پرتو پڑ رہا ہے۔ جس کے لیے صرف شعر ہی کافی نہیں۔ آپ کو اپنی قدر کرنا چاہئے۔ آپ بہت کچھ ہو سکتے ہیں۔''

اور خاص طور پر یہ جملے:

''یہ پُر جوش طبیعت ہونہار ہے۔ نثر میں ندرتِ تشبیہات سے آپ کے ذہن کی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ خدا مبارک کرے۔ کاش کسی وقت میں آپ اور اقبال یکجا ہوتے۔''

اکبر، جوش اور اقبال کے جمع ہونے کا اشارہ بیحد معنی خیز ہے۔ اس لیے کہ تینوں نظم کے شاعر ہیں اور تینوں کا تعلق گہرے سماجی شعور اور قومی و تہذیبی تصورات سے ہے۔ اکبر، اقبال سینئیر اور ان کے مقابلے جوش جونئیر ہیں پھر بھی تینوں کے جمع ہونے کا مطلب تینوں کی شاعری کی اجتماعیت، باہمی اثرات کی مماثلت ہے۔ شاید اسی جذبہ کے تحت اقبال نے

بھی جوش کو خط لکھا۔ جوش نے ''یادوں کی بارات'' میں ایک جگہ لکھا ہے:

''اسی زمانے میں میرے محترم بزرگ حضرتِ اقبال نے بھی ایک طویل خط لکھ کر میری شاعری کی مدح سرائی فرمائی اور دل کھول کر داد دی تھی اور پنجاب یونی ورسٹی سے 'روحِ ادب' کے تین نسخوں کا آرڈر بھی بھجوایا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی تحریر فرمایا تھا کہ ہر چند میرے ساغر بالکل نئے ہیں اور ایسے نئے کہ انھیں دیکھ کر غبطہ پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ان میں شراب بھری ہوئی ہے وہی پرانی، اس لیے مجھ کو چاہئے کہ میں حافظ اور ٹیگور کی پیروی ترک کر کے فکری شاعری کی طرف آجاؤں اور حافظ وخیّام کی طرح تھپک تھپک کر سلانے کے عوض انسان کو جگانے کی جانب مائل ہو جاؤں۔''

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی بلند شاعری کا طوطی بول رہا تھا اور چہار طرف اقبال ہی اقبال تھے۔ ایک نوجوان کا اثر قبول کرنا فطری تھا لیکن اس وقت جوش کسی اور دنیا میں تھے۔ لکھتے ہیں:

''اس وقت میرا تخیل دھارا زور وشور سے تصوف کی پُر اسرار وادیوں کی جانب دھڑا دھڑ بہہ رہا، ان کی نصیحت پر عمل پیرا نہیں ہو سکا لیکن 'شنیدہ اثرے دارد' کے طور پر نصیحت غیر محسوس طریقے سے مجھ پر اثر کرتی رہی اور چند ماہ وسال کے بعد میری طبیعت 'روحِ ادب' کے مزاج سے مختلف ہونے لگی۔ تصوف سے روگردانی کر کے میں سیاسی شاعری کرنے لگا۔''

اور اقبال کی جگانے والی نصیحت کو گرہ میں باندھتے ہوئے صوفی شاعری، انقلابی شاعر میں تبدیل ہوتے ہوئے اعلانیہ طور پر یہ کہہ گیا۔

خواب کو جذبۂ بیدار دیے دیتا ہوں
قوم کے ہاتھ میں تلوار دیے دیتا ہوں

لیکن جوش اس وقت حیرت میں پڑے جب بیداری کی شاعری اور بیداری کی نصیحت کرنے والا شاعر بقول جوش:

''جس وقت میری شاعری تجسس وتشکک کی جانب گامزن ہوگی تو میرے ناصح حضرتِ اقبال کی شاعری اقوال، روایات اور عقائد کی طرف چل پڑی۔ اور یہ دیکھ کر حیرت ہوگئی کہ جس تصوف اور مابعد الطبیعات سے انھوں نے مجھے روکا تھا اس پر حرکی کا لیبل لگا کر وہ خود اسی طرف چلے گئے اور عقل کو بولہب اور عشق کو مصطفٰے کا خطاب دینے اور 'السلام ایک عشقِ خوش سودائے ما کے نعرے لگانے لگے۔''

ایک جگہ اور لکھتے ہیں:

''چوں کہ وہ اعلیٰ درجے کے پڑھے لکھے اور بلا کے ذہین انسان تھے، اس لیے شروع شروع میں انھوں نے مغرب کے الحاد اور مشرق کے مابین مصالحت کی بڑے خلوص کے ساتھ کوشش کی لیکن جب ان کی سعی مشکور نہیں ہوئی تو انھوں نے نٹشے کے مافوق البشر کو مشرف بااسلام کر کے شاہین بچہ بنا دیا۔ قرآن کے مردود لفظ عشق کو آسمان پر چڑھا کر اسے تمام انسانی شرف ومجد کا مرکز تسلیم کیا اور قرآن محبوب لفظ عقل کو خاک میں ملا کر اس کو تمام مفاسد کا سرچشمہ ٹھہرا دیا اور میں چیخ اٹھا۔

چیست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیرِ ما؟''

اور پھر وہ زندگی بھر زندگی بھر بظاہر اقبال کے فکری طور پر مخالف ہی رہے، اس کی مثالیں تحریر وتقریر میں ملتی ہیں اگر چہ اس اختلاف میں جوش کی کچھ نفسیاتی پیچیدگیوں کا بھی دخل رہا ہے کہ جوش اور فراق (دونوں شعراء اقبال کے مخالف سمجھے جاتے رہے ہیں) بیحد انا پرست تھے۔ جوش نے فراق کو مجموعۂ اضداد بھی کہا ہے۔ ہم عصر گی اور شہرت کی بلندی معاصرین میں پیچیدگی بھی پیدا کر دیتی ہے جس کے شکار اکثر جوش وفراق ہوئے ہیں۔ لیکن وہی

جوش جب اقبال کا انتقال (۱۹۳۸ء) ہوتا ہے تو ان کی آنکھوں میں آنسو چھلک پڑتے ہیں۔ ایک مضمون بعنوان ''اقبال کی موت'' لکھ کر اپنی بھرپور عقیدت کا اظہار کیا جس کی ابتدا ان جملوں سے ہوتی ہے:

''جس وقت ریڈیو نے اقبال کے انتقال کی خبر سنائی ایک تیر سا جگر کے پار ہو گیا اور ضبط کی انتہائی سعی کے باوجود میری آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے اُبلنے لگے۔ یہ دیکھ کر حضرتِ آزاد انصاری نے مجھ سے کہا:

آپ کو اقبال کی اب قدر ہوئی؟

میں نے جواب دیا۔ آزاد صاحب کس روز اقبال میری نگاہوں میں ذی قدر نہ تھا ہر چند مجھے اس کے خیالات سے اختلاف تھا لیکن اس اختلاف کے باوجود مجھے اس کے شاعرانہ کمال اور اس کی مفکرانہ عظمت سے کب انکار تھا۔ اقبال ہر حالت اور ہر رنگ میں اقبال تھا۔ افسوس کہ ہماری شاعری کا آفتاب غروب ہو گیا۔ اقبال ان لوگوں میں تھا جو صدیوں اور قرنوں کی سعیٔ پیہم کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔

مت سہل ہمیں سمجھو پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردوں سے انسان نکلتے ہیں''

چند تہنیتی جملے اور دیکھئے:

''آج اقبال ہمارے درمیان موجود نہیں ہے لیکن جب تلک اس دنیا کے گوشے گوشے میں علم و ادب کا نام باقی رہے گا، اقبال زندہ و پائندہ رہے گا اور اس کے گیت ایک ملک سے دوسرے ملک تک سفر کرتے رہیں گے اور اس کا نام انسانی ذہن کے اُفق پر آفتاب کی طرح جگمگا تا رہے گا۔''

اور یہ معنی خیز جملے بھی ملاحظہ کیجئے:

''اقبال بلند مرتبہ اقبال تو مر گیا۔ بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا۔ اس
کمبخت ملک میں تیری مٹّی پلید تھی۔ ہر چند تیری موت نے ہمارے
سینوں کو سنسان اور ہمارے دلوں کو ویران کر دیا ہے مگر خود تیرے
حق میں بہت اچھا ہوا کہ تو مر گیا۔ اس ناقدر شناس غلام ہندوستان
کی سرد مہریوں سے تو نے نجات حاصل کر لی۔''

اور یہ بھی شعر دیکھئے، کس طرح ایک بڑا شاعر اپنے سے بھی زیادہ بڑے اور سینئر شاعر کو خراج عقیدت پیش کرتا ہے۔

واپس آ اقبال تجھ بن دنیا تیرو تار ہے
تیرے بدلے جوش مرنے کو تیار ہے

''یادوں کی بارات میں'' اور مختلف مقامات پر جوش نے اپنے جن معنوی اساتذہ کا ذکر خصوصی طور پر کیا ہے ان میں حافظ، نظیری، خیام، انیس، نظیر اکبر آبادی، غلاب ٹیگور کے ساتھ ساتھ باقاعدہ اقبال کا نام لیتے ہیں۔ اقبال سے انھیں فکری اختلاف ضرور تھا لیکن اس سے زیادہ احترام تھا اور ان کی عظمت کا اعتراف بھی۔

۱۹۶۰ء کے آس پاس جوش صاحب نے اورینٹل کالج لاہور کے طلباء کے ساتھ ایک شام منائی ایک طالب علم نے سوال کیا۔ کیا آپ نے اقبال کا کوئی اثر قبول کیا تو اس کا جواب نفی میں تھا لیکن جب دوسرا سوال ہوا کہ آپ کے نزدیک اقبال کی شاعرانہ حیثیت کیا ہے؟ تو جوش نے جواب دیا۔ ''علامہ اقبال کا بہت بڑا کنٹری بیوشن ہے اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔'' لیکن پاکستان کے ایک مصنف نے اپنے ایک مضمون ''علامہ اقبال جوش کی نظر میں'' نے سوال کیا کہ بقول جوش اقبال کا بڑا کنٹری بیوشن ہے تو کیا جوش صاحب کو اس کنٹری بیوشن کو سراہنے کی کبھی توفیق حاصل نہیں ہوتی۔''

یہاں بھی وہی شدت ہے جو جوش کے یہاں پائی جاتی ہے۔ سچ یہ ہے کہ جوش نے اکثر اگر نظم و نثر میں اقبال پر اعتراضات کئے ہیں تو بارہا ان کی عظمت کا اعتراف بھی کیا ہے۔ وقت آ گیا ہے کہ ان تمام روایتی تحفظات بلکہ تعصّبات کو بالائے طاق رکھ کر خلوص اور نزدیک سے ان عناصر کو سمجھنے کی اور اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے جو جوش، اقبال، عہدِ اقبال اور آفاقی اقبال سے لاشعوری طور پر متاثر ہو کر کر رہے تھے۔ یہ ایک بڑا تحقیقی و تنقیدی

موضوع ہے جس پر کسی دوسرے مقالہ میں گفتگو کی جائے گی۔ یہاں عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ہم جلد ظاہری چیزوں پر ہی یقین کر لیتے ہیں اس لیے کہ وہ دکھائی دیتی ہیں لیکن سچی گہری نگاہِ نقد اور زاویۂ تنقید ان عناصر کو تلاش کرتی ہے جو باطن میں پوشیدہ رہتے ہیں۔ اقبال حیدر کے ان جملوں کو بغور ملاحظہ کیجئے:

''اردو میں یہ دو ہی شاعر ہیں جنھوں نے منطقی استدلال کو لطیف تر شعری پیکر دے کر شعری امکانات کی لامحدودیت کو اعتبار بخشا۔ جوش چونکہ اقبال کے بعد بھی تھے اور قدرتِ زبان بھی بے پناہ رکھتے تھے اس لیے انھوں نے تقریباً شعری امکانات کو تمام قید و بند سے آزاد کرا دیا۔ شاید ہی کوئی جذبہ یا محاکمہ ایسا ہو جس کو جوش نے محاسنِ شعری سے آراستہ نہ کیا ہو۔ جوش کے تج دینے سے شعری امکانات محدود، آزادئ فکر مجروح اور اقبال کی غیر فطری، غیر معروضی اور جزوی تعبیر جڑ پکڑ گئی۔ اس خانہ زنجیر کو بے صدا ہونے سے بچانا ہماری ضرورت ہے جوش کی نہیں۔''

(بقدر ذوق نگاہ)

اور وہ یہ بھی لکھتے ہیں:

''جوش اقبا کی فکر کے منطقی وارث ہیں۔''

اور یہ بھی کہتے ہیں:

''اس پہلو کو اگر اب تک معروضیت سے پرکھا نہیں گیا تو اب پرکھنا چاہئے۔ اقبال اپنے دور کے اذہان کا پیش رو ہے، آپ اسلاف کی فکر کا مجدد ہے اور جس طرح اس نے گریز کیا ہے اور فکر و دانش کو اجتہاد کی دعوت دی ہے، اس کا لامحدود نتیجہ ہی تھا کہ اس کے بعد آنے والے ذہن اور خصوصاً سب سے زیادہ زیرک اور سریع الحس اذہان خود بھی تجدیدِ فکر کے قائل ہوں۔ اسی وجہ سے اقبال کے فوراً

بعد آنے والے اہم ترین لوگ ان سے بظاہر متصادم بھی آتے ہیں
مگر بغور مجموعی مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ ایسا ہے نہیں۔ اور
بالفرض اگر ایسا ہو بھی تو کون سی قیامت آجائے گی۔ یہی تو زندگی
علم و دانش اور فکر کا تقاضہ ہے کہ تجاوزات ہوتے رہے ہیں اور
یوں بھی بہتے ہوئے پانی کے رُخ یہ بہتے رہنے سے کون سی نئی
راہیں کُھلتی ہیں۔''

اور پھر یہ نتیجہ:

''اقبال اور جوش اردو شعریات اور ادب کو نقشِ دوام دی ہیں جن
کے بغیر اردو ادب آفاقی ادب نہیں ہو سکتا تھا۔''

یہ ایک جدید مفکر کا جدید زاویۂ تنقید اور تفہیم ہے۔ اب میں ایک پرانے غیر اور رسمی ادیب و فنکار کے جملے بھی پیش کرتا ہوں صرف اس لیے کہ کسی بڑے شاعر و کس طرح بڑے کینوس اور بڑے سیاق و سباق میں دیکھنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ محض کوری عقیدت، مداحی یا مخالفت سے اکثر ممدوح اور مداح دونوں کو ہی نقصان پہنچتا ہے۔ اقبال اور جوش دونوں ہی اس کا شکار ہوئے لیکن اس کے باوجود بیسویں صدی کے یہ دونوں ستون اس قدر مضبوط تھے کہ آج بھی ان کو ہلانا ممکن ہیں۔ مجھے احساس ہے کہ راقم نے بھی ان دونوں کو بڑے سیاق میں نہیں دیکھا شاید اس مقالہ کا مقصد کچھ اور ہی تھا۔ تاہم ممتاز افسانہ نگار احمد اکبر آبادی جو جوش کے ہم عصر تھے اور اچھے خاصے ادیب و ناقد بھی۔ جوش سے متعلق اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

''نوعِ انسان کا ارتقا، منشائے قدرت ہے اور تہذیب و تمدن ارتقا کا
ناگزیر نتیجہ.......... اگر ایک قوم کے ذہنی ارتقا کا ثبوت اس کے
ادب و شعر سے ملتا ہے تو ادب و شعر ہی اس قوم کی پستی و بلندی کا
آئینہ دار ہوتا ہے۔
''ہر کسے را بہر کارے ساختند'' ایک سچا مقولہ ہے۔ حالی کو قدرت
نے صرف اسی خدمت کے لیے مامور کیا تھا اس کے بعد کا کام اکبر

کے سپرد ہوا کہ اپنے شعر کا آئینہ دکھا کر ہمیں اپنے خط و خال سے شناسا کر دے۔ ماضی و حال کے یہ مرقعے پیش ہو چکنے کے بعد اقبال کا فرض یہ ٹھہرا کہ خودی کی مشعل جلا کر مستقبل کا راستہ روشن کرے۔ اب ارتقا کی مدح کو اس کا بھی متقاضی ہونا چاہئے کہ حالی کی نوحہ خوانی۔ اکبر کی آئینہ برداری اور اقبال کی مشعل نمائی کے بعد کوئی اور ہستی منظرِ عام پر رونما ہو جو نژادِ نو کو اسلاف کی شرافتِ نفس و خودداری بھی یاد دلائے یعنی حیات کی بشارت دے.....اسی لیے میرا خیال ہے کہ حالی، اکبر، اقبال کی شاعری کا ارتقا جوش کے ہر شعر میں نظر آتا ہے کیوں کہ جوش کی شاعری میں مجھے زندگی نظر آتی ہے جو ان کے پیش روؤں میں نہ تھی اور نہ ہو سکتی تھی۔ جوش کا کلام غزلیہ، نشاطیہ، طنزیہ و المیہ، رندانہ و شاعرانہ ہو شروع سے آخر تک حرکت و حیات سے مملو نظر آتا ہے۔'' (سخن ہائے گفتنی۔ افکار جوش نمبر)

جوش کو الگ سے نہ دیکھئے۔ اس پورے سیاق و سباق میں دیکھئے جو ل احمد نے پیش کیا ہے۔ صاف اندازہ ہوگا کہ اقبال ہوں یا جوش، ان سب کو سرسید، غالب، شبلی، حالی، اکبر، نظیر، میر سے وابستہ سلسلۂ فکر و عمل اور سماجی و تہذیبی ارتقا کے تناظر میں دیکھنا ہے اور صرف دیکھنا ہی نہیں بلکہ انسان دوستی، روشن خیالی، خرد افروزی کو فروغ بھی دینا ہے۔ اس لیے کہ فی زمانہ بدلتے ہوئے افکار و اقدار کی روشنی میں ان شاعروں کو ہماری ضرورت کم ہے، ہمیں ان شاعروں کی ضرورت زیادہ ہے۔ اپنی بقا کے لیے، اپنے ارتقا کے لیے۔ جوش کے ان چار مصرعوں پر گفتگو تمام کرتا ہوں۔

یہ تابہ زباں سخن کے لانے والے
یہ اپنے ہی خون میں نہانے والے
واللہ کہ ہیں چشم و چراغِ آفاق
یہ فکر کو آواز بنانے والے

☆☆☆

ڈاکٹر محمد عامر اقبال صدیقی
اسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف سیالکوٹ، پاکستان

بھارت میں اقبال شناسی

فکرِ اقبال تصانیف کی صورت میں جلوہ گر ہے اور اپنی ضوفشانی سے پورے عالم کو معطر کر رہی ہے۔ منظوم تصانیف میں گل ہائے رنگا رنگ کا چمن دکھائی دیتا ہے۔ بانگِ درا میں مرثیے کہے اور ساتھ ہی مغربی تہذیب کو للکارا۔ بالِ جبریل میں غزلیات کا انفرادی انداز متعارف کروایا۔ ضربِ کلیم کو عصرِ حاضر کے خلاف اعلانِ جنگ قرار دیا۔ ارمغانِ حجاز کے اردو حصہ میں ابلیس کی مجلسِ شوریٰ کا نقشہ پیش کیا۔ فارسی کلام پر نظر ڈالیں تو ہمیں اسرار و رموز سے واسطہ پڑتا ہے۔ اس طرح فکرِ اقبال کے فلسفہ خودی اور رموزِ بے خودی کو تقویت ملی۔ پیامِ مشرق گوئٹے کے پیغامِ مغرب کے جواب میں لکھی گئی۔ زبورِ عجم کو غزل نامہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ اقبال نے فرصت میں اس کا مطالعہ کرنے کی ترغیب بھی دی ہے۔ گلشن رازِ جدید لکھ کر اقبال نے محمود شبستری کی گلشنِ راز کے فلسفیانہ نو سوالات کا جواب دیا ہے۔ بندگی نامہ میں اقبال نے غلاموں کے فنونِ لطیفہ پر منظوم بحث کی اور یہ تجویز کیا کہ غلاموں کے فنونِ لطیفہ میں زندگی کی روح نہیں پائی جاتی۔ اقبال کی تصنیف جاوید نامہ خاص طور پر اہمیت کی حامل ہے۔ یہ دراصل اقبال کا سفر نامہ معراج ہے۔ یہ اقبال کے مذہبی، سیاسی اور ادبی نظریات کا نچوڑ ہے۔ اختتام پر خطاب بہ جاوید دراصل تمام نوجوانوں کے لیے پیغام ہے۔ مثنوی مسافر افغانستان کا منظوم سفر نامہ ہے۔ یہ خیبر و سرحد و غزنین اور قندھار کے عبرت انگیز مناظر اور مقبروں پر اقبال کے آنسو ہیں۔ ارمغانِ حجاز کے فارسی حصہ میں اقبال کے تمام نظریات و خیالات کا جوہر موجود ہے۔ اس میں انتہائی قابلیت سے کام لے کر کوزے میں دریائے معنی کو بند کیا گیا ہے۔ مثنوی پس چہ باید کرد کو اقبال کی شاعری کے جسم کا دل کہا جاتا ہے۔ اس کے مباحث فکرِ اقبال میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس مضمون میں فکرِ اقبال کے ان مباحث میں سے چند کا فکری مطالعہ پیشِ خدمت ہے۔ یہ مثنوی آخر اکتوبر 1936ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔(1) اقبال نے اپنے خطوط میں اس مثنوی کا ذکر کیا ہے۔ 11 جون 1936ء کو عبدالوحید خاں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:۔

'' 'ضربِ کلیم' کے بعد ایک فارسی مثنوی 'پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق' شائع ہوگی (2)

ایک خط سر راس مسعود کے نام ہے۔ ''اقبال اور بھوپال'' میں اس کی تاریخ 29 جولائی 1936ء لکھی ہے۔(3) جبکہ اس کی اصل تاریخ 29 جون 1936ء ہے۔ سید مظفر حسین برنی کی مرتب کردہ کلیاتِ مکاتیبِ

اقبال جلد چہارم میں اس خط کے حاشیہ میں برنی نے اس غلطی کی نشاندہی بھی کی ہے(4)۔اقبال نے سر راس مسعود کو لکھا کہ:۔

''3۔اپریل کی شب کو جب میں بھوپال میں تھا۔ میں نے تمہارے دادا رحمتہ اللہ علیہ کو خواب میں دیکھا۔مجھ سے فرمایا کہ اپنی علالت کے متعلق حضور رسالت مآبؐ کی خدمت میں عرض کریں۔میں اسی وقت بیدار ہو گیا اور کچھ شعر عرض داشت کے طور پر فارسی زبان میں لکھے۔کل ساٹھ شعر ہوئے۔لاہور آ کر خیال ہوا کہ یہ چھوٹی سی نظم ہے اگر کسی طرح زیادہ بڑی مثنوی کا آخری حصہ ہو جائے تو خوب ہے۔ الحمدللہ کہ یہ مثنوی بھی اب ختم ہو گئی ہے۔مجھ کو اس مثنوی کا گمان بھی نہ تھا۔بہر حال اس کا نام ہوگا''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق''ضربِ کلیم کی طباعت کے بعد اس کی کتابت شروع ہو گی''

اس طرح یہ واضح ہے کہ 3۔اپریل1936ء کو اس مثنوی کی ابتدا ہوئی۔سب سے پہلے اس کا آخری حصہ جو حضور رسالت مآبؐ میں عرض داشت ہے، پہلے معرض تحریر میں آیا۔اس عرض داشت کا موجب ایک خواب ہے جس کا ذکر سر راس مسعود کے نام خط میں کیا گیا ہے۔اس مثنوی کے نفسیاتی پس منظر کو سمجھنے کے لیے ہمیں یہ یاد رکھنا ہوگا کہ اس سے قریبی زمانہ میں تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے بعد قرطبہ جا کر مسجد قرطبہ کے نظارے سے دل میں صلوٰۃ اور درود اور لب پر بھی صلوٰۃ اور درود کے وجد آفریں مرحلے سے گزر چکے تھے۔ افغانستان کے حکمران نادر شاہ کی دعوت پر افغانستان کی سیاحت کر چکے تھے۔علامہ کی صحت مسلسل گرتی جا رہی تھی۔ردِعمل کے طور پر ان کے سوز و گداز میں اضافہ ہو گیا۔اس مثنوی کے لکھنے کا خیال اس عرض داشت کے بعد آیا تھا جو اقبال نے ختمی مرتبتؐ کے حضور میں پیش کی تھی۔اس عرض داشت ہی نے انہیں اس بات کی ترغیب دی ہو گی کہ وہ حضورؐ کے ارادت مندوں سے خطاب کریں۔

ان امور کے ساتھ ساتھ اس نکتے کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہیے کہ تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر اقبال نے برطانوی استعمار کے نمایاں رخ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے ہوں گے۔انہیں احساس ہو گیا ہوگا کہ سات سمندر پار کے سیاست دان ہندوستان کے متعلق کیا سوچتے ہیں اور کس طرح سوچتے ہیں۔اس سے انہیں یہ تحریک ہوئی کہ اقوامِ مشرق سے خطاب کیا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ غلامی کی زنجیروں کو کسی طرح کاٹا جا سکتا ہے اور انہیں آزادی حاصل کرنے کی خاطر کیا کچھ کرنا ہوگا۔

یہ مثنوی اس زمانہ میں صفحہ قرطاس پر صورت گیر ہوئی جب اقبال اپنی فکر کے اعتبار سے پختگی کی آخری منزل تک رسائی حاصل کر چکے تھے۔اس مثنوی کے چودہ ابواب ہیں یا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسے چودہ عنوانات میں تقسیم کیا گیا ہے۔اس مثنوی میں اقبال نے کہیں بھی حکایت طرازی سے کام نہیں لیا۔یوں لگتا ہے جیسے اقبال کو

اپنی طویل علالت سے نیم شعوری طور پر یہ احساس ہو گیا کہ ان کے اور وادی خموشاں کے درمیان بہت کم مسافت رہ گئی ہے۔ وہ افراد ملت سے جو کچھ کہنا چاہتے ہیں اسے جلد از جلد کہہ دینے کے آرزومند ہیں یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑی اختصار پسندی کا ثبوت دیا ہے اور طویل گفتگو سے پرہیز کیا ہے۔

یہ مثنوی اقبال کی وہ تیسری شعری تخلیق ہے جس کے آغاز میں انہوں نے اس کتاب کے پڑھنے والوں سے خطاب کیا ہے۔ پہلی کتاب ''زبورِ عجم'' ہے جس میں اقبال نے ''بخوانندہ کتاب زبور'' کا عنوان مقرر کیا ہے۔(5) دوسری کتاب اقبال کا تیسرا اردو مجموعہ کلام ہے۔ ''ضرب کلیم''۔ اس میں اس نوعیت کی مخاطبت کے لیے ''ناظرین سے'' کا عنوان قائم کیا ہے۔(6) اور مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' میں جو عنون نظر آتا ہے وہ ہے۔ ''بخوانندہ کتاب'' (7) یہاں کتاب پر اقبال نے اکتفا کیا ہے اور زبورِ عجم کتاب کے ساتھ کتاب کا نام زبور کا اضافہ کر دیا ہے۔ بخوانندہ کتاب میں کل چار اشعار ہیں اور ان چاروں شعروں میں عقل کے مقابلے میں عشق کی بالا دستی واضح کی گئی ہے۔(8) دراصل ہند اور بیرون ہند کے سیاسی اور اجتماعی حوادث نے ان کو اس قدر متاثر کیا کہ ایک پوری مثنوی کی شکل بن گئی۔ اس مثنوی کے موضوعات درج ذیل ہیں۔

۱۔ بخوانندہ کتاب، ۲۔ تمہید، ۳۔ خطاب بہ مہر عالمتاب، ۴۔ حکمت کلیمی، ۵۔ حکمت فرعونی، ۶۔ لا الہ الا اللہ، ۷۔ فقر، ۸۔ مرد حر

۹۔ دراسرار شریعت، ۱۰۔ اشکے چند برافراق ھندیاں، ۱۱۔ سیاسیات حاضرہ، ۱۲۔ حرفے چند با امت عربیہ، ۱۳۔ پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق، ۱۴۔ درحضور رسالت مآبؐ۔ اس مثنوی میں سب سے پہلے اقبال پیر رومی کی زبان سے یہ خوش خبری سناتے ہیں کہ:

؎ گفت جانہا محرم اسرار شد   خاورؔ از خواب گراں بیدار شد(9)

مولانا روم نے اقبال کو خبر دی کہ مشرق والے زندگی کے راز سے واقف ہو چکے ہیں اور گہری نیند سے جاگ اٹھا ہے۔ پیرِ رومی نے اقبال کو نصیحت کی کہ تم اہل مشرق کو دین اور سیاست کے معانی سمجھا دو۔ چنانچہ اول حکمت کلیمی اور حکمت فرعونی کے خصائص بتا کر اقبال نے ان کا موازنہ کیا ہے۔ دیگر درج کردہ عنوانات میں سیاست حاضرہ پر تبصرہ اور امت عربیہ سے خطاب کر کے انہیں ماضی یاد دلایا گیا ہے۔ پھر تمام اقوام مشرق کو خطاب کر کے دریافت کرتے ہیں کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ اقبال نے خود ہی اس کے جواب میں سیاست فرنگ کا طلسم توڑ کر اقوام ایشیاء کو عوامی بیداری کا پیغام دیا ہے اور سرسید احمد خاں کی ہدایت کے مطابق بارگہ رسالتؐ میں فریاد کی ہے۔ مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' کا مطالعہ کرنے سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اقبال کی ساری شاعری جسم ہے اور مثنوی پس چہ باید کرد اس کا دل ہے۔ سید یوسف سلیم چشتی نے جب اس بات کا اظہار

اقبال کے سامنے کیا تھا تو اقبال بھی یہ سن کر مسکرا دیے۔(10) اقبال کے نزدیک اس مثنوی کا مقصد مشرق کے افراد کو بیدار کرنا تھا۔اب اس مثنوی کے منتخب موضوعات پر نظر ڈالتے ہیں۔

حکمت کلیمی:۔

اقبال نے ''پس چہ باید کرد اے اقوام مشرق'' میں ''حکمت کلیمی'' کو خاص اہمیت دی ہے۔کلیم اور فرعون دو مختلف شخصیات ہیں۔یہ دو متضاد اور متصادم قوتوں کی نمائندگی بھی کرتی ہیں۔اقبال کے کلام میں یہ دو لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوئے ہیں دو قوتوں کی علامتوں کے طور پر ہی استعمال ہوئے ہیں۔کلیمی ایک ایسی قوت ہے جو حکمت الٰہیہ سے مربوط ہے اور اس کے مقابلہ میں فرعونیت ابلیسی قوت سے عبارت ہے۔کلیمی نبوت ہے اور فرعونیت نبوت کے خلاف جانے والی ایک فعال قوت ہے۔کلیمی ان تمام رجحانات پر محیط ہے جن کا تعلق محاسن اخلاق سے ہے۔کلیمی انسانیت کا حسن ہے۔یہ اللہ کی برکت ہے، اللہ کے بندوں پر۔ یہ نیکی کا راستہ ہے مخلوقِ خدا کیلئے اس کے برعکس فرعونی حکمت اس حسن کو بدصورتی میں بدل دیتی ہے۔اس برکت کو شر میں منتقل کرنے کی آرزومند ہے اور نیکی کے اس راستے میں جا بجا رکاوٹیں کھڑی کر دیتی ہے۔ہم کہہ سکتے ہیں کہ کلیمی وہ سب کچھ ہے جو اللہ کو پسند ہے اور فرعونیت یا حکمتِ فرعونی سے مراد قول وفعل کی وہ ساری صورتیں ہیں جو ابلیس کو پسند ہیں۔

اپنے کلام کے ابتدائی حصہ میں اقبال نے کلیمی کو روایتی انداز میں استعمال کیا ہے مثلاً غزل کا ایک شعر ہے

؎اڑ بیٹھے کیا سمجھ کے بھلا طور پر کلیم طاقت ہو دید کی تو تقاضا کرے کوئی (11)

اقبال کے شعور میں جیسے جیسے پختگی آتی گئی کلیم کا تصور فرسودہ روایات سے اپنا دامن چھڑاتا چلا گیا یہاں تک کہ وہ خدائی قوت کا ایک استعادہ بن گیا۔کلیمی کی اصطلاح اقبال کے ہاں خدائی قوت کی بھرپور نمائندہ بن گئی اور طاغوتی طاقتوں کے خلاف انتہائی شدید مخالفانہ رویہ اختیار کرتی چلی گئی۔''ضرب کلیم'' اقبال کے تیسرے شعری مجموعہ کا نام ہے۔اس نام کے نیچے درج ہے''اعلان جنگ' دور حاضر کے خلاف (12) اس کے بعد جو قطعہ ہے اس میں اقبال نے مشورہ دیتے ہوئے کہا ہے کہ:

خودی میں ڈوب کے ضربِ کلیم پیدا کر(13)

بالِ جبریل میں اقبال نے کہا۔

؎رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد (14)

مہاتما بدھ کی فاقہ کشی برہمیت کے خلاف ایک باغیانہ اقدام تھا مگر صرف فاقہ کشی عملاً بے سود ہے اور یہ اس وقت مفید ہو سکتا ہے جب یہ فاقہ کشی نہ رہے بلکہ ایک قوت کا مظاہرہ بھی بن جائے۔کلیمی کی روح وہ عصا

ہے جو اژدہا کی صورت میں فرعونیت کے تمام سانپوں کو نگل جاتا ہے۔ یہ عصا قوت کی فعالیت سے عبارت ہے ورنہ یہ عصا کلیمی یا قوت سے محروم کلیمی کی فاقہ کشی کے قریب ہی کی کوئی چیز بن جاتا ہے۔ اقبال نے حکمتِ کلیمی کی وضاحت کے لیے ابتدا یوں کی۔

؎ تانبوّت حکم حق جاری کند　　پشت پا ہر حکم سلطاں می زند (15)

نبوّت جب احکام الٰہی کا اجرا کرتی ہے تو شاہی احکام کو ٹھکرا دیتی ہے۔ کلیمی نبوّت ہے۔ کلیمی حضرت موسیٰؑ کا تشخص ہے۔ اور یہاں سلطان سے مراد حکمت فرعونی ہے۔ فرعونیت دراصل فرعون کا تشخص ہے اور حضرت موسیٰؑ نے فرعون کے حکم کو ٹھکرا دیا تھا۔ اقبال نے حکمتِ کلیمی کے تقاضوں کی وضاحت کرتے ہوئے کہا تھا۔

درنگاہش قصرِ سلطاں کہنہ دیر　　غیرت او برنتابد حکم غیر
پختہ سازد صحبتش ہر خام را　　تازہ غوغائے دہد ایّام را
درسِ او اللہ بس باقی ہوس　　تا نیفتد مردِ حق در بندِ کس
از نمِ او آتش اندر شاخِ تاک　　در کفِ خاک از دمِ او جانِ پاک
معنیٔ جبریل و قرآن است او　　فِطرۃَ اللہ را نگہبان است او
حکمتش برتر ز عقلِ زوفنوں　　از ضمیرش اُمّتے آید بروں (16)

نبوّت کی نگاہ میں شاہی محل کی حیثیت پرانے بت خانے سے بڑھ کر نہیں ہوتی۔ اس کی غیرت کسی غیر اللہ کے حکم کو برداشت نہیں کرتی۔ اس کی شخصیت ہر خام کو پختہ بنا دیتی ہے۔ وہ زمانے کو نیا جوش اور ولولہ عطا کرتا ہے۔ اس کا پیغام صرف ایک ہی ہے کہ خدا ہی کی ذات کافی ہے باقی سب ہوس ہے۔ حکمت کلیمی کا مقصد یہ ہے کہ مردِ حق کسی اور کے دام میں نہ پھنسے۔ حکمتِ کلیمی کی نمی سے انگور کی شاخ میں بھی آگ بھر جاتی ہے۔ حکمتِ کلیمی دراصل جبریل اور قرآن کی تفسیر ہے۔ حکمت کلیمی دراصل دینِ اسلام کی محافظ ہے۔ حکمت کلیمی مکار اور عیار عقل سے افضل و اعلیٰ ہے۔ اس کے ضمیر سے نئی ملت وجود میں آتی ہے۔

کلیمی دراصل نبوت ہے اور نبوت وہ سب کچھ کرتی ہے جس کا اظہار اقبال نے ان اشعار میں کیا ہے کلیمی شریعت موسوی سے الگ کوئی چیز نہیں اور تاریخ گواہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ نے اپنی حکمت سے فرعون کا ظلم سہنے والی منتشر قوم کو ظلم و ستم کے جہنم سے نکالنے کی بھرپور کوشش کی تھی اور مظلوم مخلوقِ خدا کو فرعون کے ظلم و ستم کے جہنم سے نکال بھی لیا تھا۔ آگے چل کر اقبال نے کہا۔

؎ بحر و بر از زور طوفانش خراب　　درنگاہ او پیام انقلاب

اس کے زور سے بحر و بر تباہ و برباد ہو جاتے ہیں، اس کی نظر میں انقلاب کا پیغام ہے۔

؎ صحبتِ او ہر خزف را در کند حکمتِ او ھر تہی را پُر کند (17)

اس کی رفاقت ریت کے زرے کو موتی بنا دیتی ہے اور اس کی حکمت ہر خالی کا دامن بھر دیتی ہے۔ کلیمی بندہ درماندہ سے براہ راست مخاطب ہو کر کہتی ہے۔

؎ بندۂ درماندہ را گوید کہ خیز ہر کہن معبود را کُن ریز ریز (18)

کلیمی بندہ درماندہ کو بیدار کرتی ہے وہ گرے ہوئے غلام کا حوصلہ بڑھاتی ہے تا کہ وہ غفلت کی نیند سے بیدار ہو جائے اور جو طرز کہن اسے نظر آئے وہ اسے مٹا دے اور جو بھی پرانے بت اسے دکھائی دیں انہیں پاش پاش کر دے۔ غلامی کے دور میں اسے مسحور کرنے والے جتنے بھی بت تھے انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دے۔

کلیمی ہر دور میں زندہ رہی ہے اور ہر دور میں اس نے ایک نئے انداز سے فرعونیت یا حکمت فرعونی کا مقابلہ کیا ہے۔ کلیمی کو اصطلاحاً چراغِ مصطفویؐ بھی کہا جاتا ہے اور اقبال نے اپنے ایک شعر میں کہا ہے۔

؎ ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز چراغ مُصطفویؐ سے شرارِ بُولہبی (19)

ابولہب حضرت محمدؐ کے ایک چچا کی کنیت تھی جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ شرار بولہبی دراصل کفر کا شرارہ ہے۔ اس دنیا کی پیدائش سے آج تک کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو یہی دکھائی دے گا کہ کفر کا شرارہ ایمان کے چراغ سے لڑتا رہا ہے۔ چراغ مصطفویؐ دراصل حکمت کلیمی ہے اور شرار بولہبی حکمت فرعونی ہے۔ دونوں کا تصادم ہمیشہ ہی رہا ہے۔ کلیمی ایک دور تک محدود نہیں ہے اور فرعونیت کو بھی صرف ایک عہد یا ایک ہی دور سے وابستہ نہیں کیا جا سکتا۔

حکمتِ فرعونی:۔

حکمتِ فرعونی کیا ہے؟ اقبال نے کہا کہ میں نے حکمتِ ارباب دین یعنی حکمتِ کلیمی کی وضاحت کر دی ہے اور اب حکمتِ اربابِ کیں یعنی حکمتِ فرعونی کی روح بے نقاب کرتا ہوں۔

؎ حکمتِ اربابِ کیں مکر است و فن مکر و فن؟ تخریب جاں تعمیرِ تن (20)

حکمتِ فرعونی مکر و فن کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔ مکر و فن بھی ایسا جو روح کو تو تباہ کر دیتا ہے البتہ جسم کی تعمیر ضرور کرتا ہے۔

؎ از دمِ او وحدت قومے دو نیم کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم (21)

حکمتِ فرعونی سے قوم کی وحدت ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ اس کا مدمقابل حضرت موسیٰؑ کا عصا ہے۔ حکمتِ فرعونی کا بنیادی تقاضا یہ ہوتا ہے کہ یہ قوم کے اندر انتشار پیدا کر دے اور اس کے خلاف بغاوت صرف حکمتِ کلیمی ہی کرتی ہے۔ چوبِ کلیم یا عصائے کلیم علامت ہے حکمتِ کلیمی کی۔ آگے چل کر اقبال بتاتے ہیں

کہ حکمتِ فرعونی معاشرے کو کس رنگ، کس کس انداز اور کس کس صورت میں متاثر کرتی ہے۔

حکمتِ فرعونی قوم کو محکوم بنا دیتی ہے۔ قوم میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رہتی۔ اسے غیور اولاد کا تحفہ نصیب نہیں ہوتا۔ اس کے جسم میں روح تو ہوتی ہے مگر ایسے کہ کوئی مردہ کسی قبر میں ہو۔ ایسی قوم کے بوڑھوں میں حیا نام کی کوئی چیز باقی نہیں رہتی۔ ایسی قوم کے نوجوان لڑکے عورتوں کی طرح اپنے بدن کی سجاوٹ میں مصروف رہتے ہیں۔ حکمتِ فرعونی کے زیر اثر قوم میں پیدا ہونے والے بچے ماؤں کے پیٹ سے ہی مردہ پیدا ہوتے ہیں۔ ایسی قوم کی بیٹیاں خود ہی اپنی زلفوں کی اسیر ہوتی ہیں۔ حیا سے بیگانہ، خودنما اور دوسروں کی سوچ سے متاثر ہوتی ہیں۔ وہ بڑی بنی ٹھنی، سجی سنوری، اور دل پھینک ہوتی ہیں۔ ان کی بھنویں دودھاری تلوار کی طرح ہوتی ہیں۔

پیرانِ کہن، نوجوان خود ہیں اور دخترانِ آزاد طبع کی بے حیائی، شوخ چشمی اور خودنمائی کا کتنا عبرت انگیز نقشہ کھینچا گیا ہے۔ یہ نقشہ اقبال کے اپنے دور کی حکمتِ فرعونی کا ہے مگر حکمتِ فرعونی کو فقط ایک عہد تک محدود نہیں کیا جا سکتا۔

آج حکمتِ فرعونی ''روشن خیالی'' کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ مادر پدر آزادی اور مرد و زن کا اختلاط نت نئی چالوں سے حملہ آور ہے۔ حکمتِ کلیمی کی راہ اپنانے والوں کو سب سے پہلے دقیانوسیت کے بد خطاب سے نوازا جاتا ہے۔ حکمتِ فرعونی نے اپنے بتوں کا جال پھیلا رکھا ہے۔ اس کے بت کبھی زبان کا جادو پڑھ کر تعصب کی آگ کو ہوا دیتے ہیں تو کبھی حسب نصب کے جادو سے انسانوں کا دل پتھر کا کر دیتے ہیں۔ کبھی علاقائی حدود و قیود کا وار چلاتے ہیں تو کبھی مذہب کے نام پر قوموں میں پھوٹ ڈالتے ہیں۔ حکمتِ فرعونی نے جذبِ اندروں چھین لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صفیں کج ہیں۔ دل پریشاں ہیں اور سجدے بے ذوق ہو چکے ہیں۔ حکمتِ فرعونی تو باطل ہے جبکہ حکمتِ کلیمی حق کا نام ہے۔ سچ کا نام ہے۔ یہ تو صداقت ہے اور پھر سچ اور حق کی صداقت کے لیے کٹ مرنے کا نام ہے۔ حق آتا ہے تو باطل چلا جاتا ہے۔ اسے چلا ہی جانا چاہیے کیونکہ باطل تو آتا ہی جانے کے لیے ہے۔ آج ہم نے باطل کا راستہ روکنے کے لیے حکمتِ کلیمی کو بے اثر سمجھ لیا ہے۔ ہم خوفزدہ ہیں کہ آج ہمارا عصا طاغوتی سانپوں کو کیسے کھائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ وجہ یہ ہے کہ ہم نے حکمتِ کلیمی کو محض ایک قصہ بنا لیا۔ صرف ایک داستان بنا دیا۔ واعظ اور خطیب کے لیے لچھے دار تقریر کا باعث بنا لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حکمتِ کلیمی بے اثر ہوتی گئی، کتابوں میں دفن ہوتی گئی اور پھر حکمتِ فرعونی نے اس پر مصلحت کا غلاف چڑھا دیا۔

حکمتِ فرعونی کے کئی رنگ ہیں۔ شیطان حکمتِ فرعونی کو پروان چڑھاتا ہے۔ ابلیس کے لیے حکمتِ

فرعونی موثر ثابت ہوتی ہے۔ ابلیس اپنی بدحرکات کے لیے حکمتِ فرعونی کا سہارا لیتا ہے۔ حکمتِ فرعونی کی کامیابی کے بعد ابلیس اعلان کر چکا ہے کہ آج خدا کے بندے نام تو خدا کا کہتے ہیں، ہر کام کی ابتدا تو خدا کے نام ہی سے کرتے ہیں مگر اس کے بعد جو کام بھی کرتے ہیں وہ ابلیس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ حکمتِ فرعونی نے لوگوں کے دل بدل دیے، ذہن بدل دیے، سوچ تبدیل کر دی۔ لوگ حکمتِ فرعونی کو برا بھی نہیں جانتے اور مصلحت کے نام پر اسے جائز قرار دینے کے بھی درپے رہتے ہیں۔

حکمتِ فرعونی نے عورت کو نیم عریاں کیا اور بڑے بڑے دیواری اشتہارات کے علاوہ قدِ آدم بورڈز پر سجا کر عورت کو رسوا کر دیا۔ اسے روشن خیالی کا لباس پہنایا اور اپنی ثقافت اور روایات کے مقابل لا کھڑا کیا۔ حکمتِ فرعونی کا راستہ روکنے کے لیے جس نے حکمتِ کلیمی کی آواز بلند کی، اسے معاشرے میں نامکمل قرار دیا گیا۔ حکمتِ فرعونی کا راستہ روکنے والوں کو جو ہاتھ اور زبان سے برائی کا خاتمہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو یہ سبق دیا گیا کہ وہ صرف دل سے اسے برا جان سکتے ہیں، کسی دوسرے کے خیالات اور نظریات کا راستہ نہیں روک سکتے۔

اس نظریہ نے حکمتِ فرعونی کو پروان چڑھنے میں بھرپور مدد کی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہم زبردست اخلاقی اور تہذیبی بحران کا شکار ہو گئے۔ نیکی اور اچھائی کے کاموں میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے میں اپنا نقصان سمجھنے لگے۔ بدی کے کاموں میں دوسروں کا راستہ روکنے کی جرات گنوا بیٹھے۔

جہانِ تگ و دو میں غیرت بڑی چیز تھی جو درویش کو تاجِ سرِ دارا پہناتی تھی، وہ غیرت کہیں جا کر سو گئی۔

حکمتِ فرعونی کسی خاص دور سے منسوب نہیں ہے۔ آج بھی جو لوگ ابلیسی چالوں پر عمل پیرا ہوتے ہیں وہ حکمتِ فرعونی ہی کے ماننے والے ہیں اگر انہیں اس بات کا احساس ہی دلا دیا جائے تو شاید حکمتِ کلیمی پروان چڑھ سکے۔ حکمتِ کلیمی پروان چڑھانا دراصل توحید کو عام کرنا ہے۔ حکمتِ کلیمی پر عمل پیرا ہونا حدیثِ نبویؐ پر عمل پیرا ہونا ہے۔ حکمتِ فرعونی اس کی ضد ہے۔ عصرِ حاضر اس بات کا متقاضی ہے کہ حکمتِ کلیمی کے لیے راہیں ہموار کی جائیں اور حکمتِ فرعونی کا راستہ روکا جائے۔ ورنہ ہماری داستان بھی دنیا کی داستانوں سے مٹا دی جائے گی۔ ہمیں تاریخ سے سبق سیکھنا چاہیے۔ حکمتِ فرعونی کے مقابلہ کی خاطر حکمتِ کلیمی کا سہارا لینا چاہیے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر خود تاریخ ہی ہمیں اچھی طرح کوئی سبق سکھا دے اور غلامی کا بند ہمارے گرد مضبوط دیوار بنا لے اور ہم اس میں گھٹ کر مر جائیں۔

سیاسیاتِ حاضرہ:۔

اقبال نے سیاسیاتِ حاضرہ پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے اسے ''بے بصر'' قرار دیا ہے۔ بے بصر اس

لیے کہ یہ ان زنجیروں کو مضبوط سے مضبوط تر کر دیتی ہے جن میں غلام جکڑے رہتے ہیں۔
اقبال نے مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق'' سے بہت پہلے بانگِ درا میں کہا تھا۔

؎ ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے(22)

مسلمان دنیا کی عجیب حالت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ آدمی آج بھی بادشاہی کا شکار بنا ہوا ہے۔ آج کے آدمی کو ایک لمحہ چین نصیب نہیں ہے۔ آج کیسے دردناک مناظر سامنے آتے ہیں کہ انسان اپنے ہی ہم جنسوں کا شکار کرتا پھر رہا ہے۔ سرمایہ داروں اور حکمرانوں نے اپنے اغراض و مقاصد کے لیے انسانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رکھا ہے۔ ملوکیت میں ہوتا بھی یہی ہے کہ خود انسان ہی انسان کا شکار کھیلتا ہے۔ اسلام کی روح تو کبھی بھی ملوکیت کی روادار نہیں ہو سکتی۔

موجودہ زمانے کی سیاست جو مغربی پیداوار ہے یہ بلاشبہ ہے تو بڑی چمکدار اور اس کی تیز روشنی سے آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں لیکن خیال رہے کہ اس کے سب رنگ جھوٹے ہیں۔ ان رنگوں کو بڑی کاریگری سے نگینوں کی طرح جوڑ دیا گیا ہے۔ اس جمہوریت کا بڑا زور و شور ہے مگر اقبال کے نزدیک یہ جمہوریت کیا ہے؟

؎ گرمیٔ ہنگامۂ جمہور دید پردہ بر روئے ملوکیت کشید(23)

اس نے عوام کے ہنگامے کی گرمی دیکھی تو ملوکیت یعنی بادشاہت کے چہرے پر پردہ ڈال دیا اقبال نے مغرب کے جمہوری نظام کے حوالہ سے بانگِ درا میں کہا تھا کہ:۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری(24)

یورپ جس جمہوری نظام کو لیے پھرتا ہے، یہ کوئی نیا ساز نہیں ہے۔ یہ وہی پرانا انداز ہے اور پرانی باتیں ہیں۔ اس ساز کے پردوں سے شہنشاہی کے ترانے بھی نکلتے تھے اور اب وہی راگ الاپا جا رہا ہے۔ جمہوریت کے لباس میں شہنشاہی اور مطلق العنانی کا جن رقص کر رہا ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ آزادی کی نیلم پری ہے۔ یورپ والوں نے محکوم ممالک کی نمائندگی کے لیے جو ادارے قائم کر دیے ہیں وہ حقیقت میں آزادی کی دستاویز نہ تھی بلکہ انہوں نے اپنی مطلق العنانی کو ایسا لباس پہنا دیا تھا جسے جمہوری کہا جا سکے۔ محکوموں نے اسے آزادی سمجھ کر ہنسی خوشی قبول کر لیا اور وہ حقیقی آزادی کے لیے کوششیں چھوڑ کر ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو گئے۔

سیاسیاتِ حاضرہ آدمی کو آزادانہ فضاؤں میں پرواز کرنے کی اجازت ہی نہیں دیتی۔ یہ بال و پر چھین لیتی ہے۔ اور انسان کے ہاتھ میں ایک ایسی کلید / چابی / کنجی دے دیتی ہے جس سے کوئی دروازہ بھی نہیں کھل

سکتا۔اس کی فریب کاری ملاحظہ فرمایئے کہ گرفتار پرندے سے کہتی ہے کہ دشت اور مرغزار میں گھونسلا بنانا ایک خطرناک اقدام ہے کیونکہ یہاں شاہین و چرغ یعنی شکرے کسی بھی وقت حملہ آور ہو سکتے ہیں۔ سیاستِ حاضرہ انسان کو نصیحت کرتی ہے اور مشورہ دیتی ہے کہ اپنا گھونسلا خانہ صیاد میں تعمیر کرنا چاہیے۔اس جگہ کوئی زبردست اور خطرناک پرندہ حملہ آور نہیں ہوسکتا۔ گویا پیغام دیا جاتا ہے کہ کسی ایک سپر پاور، خاص طور پر امریکہ سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ یاد رہے کہ سیاسیاتِ حاضرہ محض فریب ہے۔ یہ سراب ہے۔اربابِ سیاست کی گفتگو میں یوں تو بڑی حرارت ہوتی ہے مگر ان کی تقریر پہلودار ہوتی ہے۔یعنی یہ حضرات ایسے الفاظ استعمال کرتے ہیں جن کے کئی معنی نکل سکتے ہوں۔

اقبال کہتے ہیں:۔

؎ از خودی غافل نہ گردد مردِ حر حفظ خود کن حب افیونش مخور (25)

اقبال نے نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے کہ مردِ آزاد اپنی خودی سے غافل نہیں رہتا۔اپنی غیرت کا سودا نہیں کرتا۔اپنی حفاظت خود کرتا ہے۔اقبال نے دکھی دل سے نصیحت کرتے ہوئے کہا کہ مغربی سیاست جو سیاست حاضرہ کے روپ میں رواں دواں ہے اس کی افیون سے گولی نہیں لینی چاہیے۔اپنا تحفظ خود کر،اس افیون سے پرہیز کر جو محبت میں لپیٹ کر تمہیں دی جارہی ہے۔ یہ اربابِ سیاست حاضرہ بھی ساحرالموط سے کم نہیں ہیں جو اپنے اسیروں کو برگِ حشیش دیتا ہے اور اسے شاخ نبات کہتا ہے۔

؎ ساحرالموط نے تجھ کو دیا برگ حشیش اور تو اے بے خبر سمجھا اسے شاخ نبات (26)

کوہ الموط کا جادوگر بھنگ کی پتیاں پلاتا پھرتا ہے۔غافل اور غلام قوم کے افراد کی سوچ بدل جاتی ہے اور پھر ان کے لیے بھنگ کی ڈلی بھی گھڑے کی مصری بن جاتی ہے۔سرمایہ دار آقا اپنے غلاموں کو مدہوش رکھنے میں عافیت سمجھتے ہیں۔اقبال نے کہا:۔

؎ پیش فرعوناں بگو حرفِ کلیم تا کند ضرب تو دریارا دو نیم (27)

اقبال نے حوصلہ بڑھاتے ہوئے وقت کے فرعونوں کے سامنے حضرت موسیٰؑ کے انداز میں بات کرنے کی نصیحت کی۔اس طرح ضربِ کاری سے دریا کو دو نیم کیا جاسکتا ہے۔ضربِ کلیمی سے صحرا و دریا کو ریزہ ریزہ کیا جاسکتا ہے اور پھر ضربِ کلیمی ہی کی ہیبت سے پہاڑ بھی روئی کے گالے بن جاتے ہیں۔

سیاست حاضرہ میں اقبال کو اپنے تھکے ماندے کارواں کا خیال بھی دامن گیر ہو جاتا ہے۔اقبال نے اس بات پر گہرے غم کا اظہار کیا ہے کہ اس کارواں کے امیر میں ''نورِ جاں'' نہیں ہے۔اقبال نے اسے تن پرست، جاہ مست اور کم نگاہ کہا ہے۔لا الہ کا حقیقی تقاضا کیا ہے؟ میر کارواں اس سے بے خبر ہے۔میر کارواں

کے رخت سفر میں بلندی نگاہ، سخن کی دلنوازی اور پرسوزی جاں ہونی چاہیے اقبال نے کہا کہ میرِ کارواں پیدا تو حرم میں ہوا مگر وہ کلیسا کا مرید ہے۔ افسوس، اس نے ہمارے قومی ننگ و ناموس کا پردہ چاک کر دیا۔

اقبال نے اہل کارواں کو نصیحت کی کہ ایسے میر کارواں کا دامن نہ تھامو۔ کیونکہ اس کے سینے میں روشن دماغ نہیں ہے۔ اقبال کو سب سے بڑا دکھ اس بات پر ہے کہ ''ملت اسلامیہ'' خودی سے محروم ہو چکی ہے۔ یہ اب ایک ایسا تنکا بن چکی ہے جسے ہوا کے جھونکے جہاں چاہیں اڑا کر لے جا سکتے ہیں۔

؎ آں سرور آں سوزِ مشتاقی نماند در حرم صاحبدلے باقی نماند (28)

اقبال کہتے ہیں کہ نہ وہ لطف باقی رہا نہ وہ محبت کا سوز رہا۔ حرم میں کوئی بھی صاحبِ دل باقی نہ رہا۔ اقبال نے ہر فردِ ملت کو یہی پیغام دیا کہ:۔

؎ زیستن تا کے بہ بحر اندر چو خس سخت شو چوں کوہ از ضبطِ نفس (29)

اقبال کہتے ہیں کہ تو کب تک سمندر میں تنکے کی مانند زندگی بسر کرے گا۔ ضبطِ نفس سے تو پہاڑ کی طرح سخت ہو جا۔ عقلمند آدمی کسی دوسرے کو اپنے دل کا حال نہیں سناتا مگر اقبال کسی سے اپنے دل کا درد نہ چھپا سکے۔ اقبال نے واضح کیا کہ غلام اور غلامی کے دور میں پیدا ہونے والے اپنے مرکز سے بھٹک جاتے ہیں۔ اقبال نے کہا کہ جب میں حضورؐ پر درود بھیجتا ہوں تو شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہوں۔ اقبال نے محکوم کے سینے میں بتوں کا غلبہ بتایا ہے۔ اس لیے پہلے اپنے سینے کو بتوں سے خالی کرنا ہوگا پھر حضورؐ پر درود بھیجنا چاہیے۔ سیاستِ حاضرہ نے لوگوں کی نمازوں میں قیام کو بے حضور کر دیا اور سجدوں کو سرور سے عاری۔ جبکہ آزاد آدمی کا سجدہ یہ شان حاصل کرتا ہے کہ نیلا آسمان بھی اس کا طواف کرتا ہے۔ غلام لوگ خدا کے جلال و جمال سے بے خبر ہوتے ہیں۔ غلام میں ایمان کی لذت تلاش نہیں کی جا سکتی۔ حافظِ قرآن اگر غلامی کی زندگی بسر کرتا ہو تو بھی اس کی آیات قرآنی اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بظاہر تو وہ صاحبِ ایمان ہوتا ہے مگر اس کا پیشہ بت گری ہوتا ہے۔ اس کا دین اور عرفان سب محض کافری ہے۔ اگر ہمارے اندر سوز حیات باقی ہو تو سمجھو ہماری معراج ہے۔ اگر جسم میں گرم خون نہ ہو تو سمجھو کہ سجدے بھی پرانی رسم کے سوا کچھ نہیں۔ اقبال نے کہا:

؎ عیدِ آزاداں شکوہ ملک و دیں عیدِ محکوماں ہجوم مومنیں ! (30)

آزاد قوموں کی عید، ملک اور دین کی شان و عظمت ہے جبکہ غلاموں کی عید صرف مسلمانوں کا ہجوم ہے۔ بہت سے مسلمان یک جا ہو جاتے ہیں مگر قومی، ملی اور مذہبی فریضہ کی ادائیگی کے لیے کوئی نسخہ کیمیا ساتھ نہیں لے جاتے۔ اتنا ہجوم ہونے کے باوجود حالات حاضرہ پر غور نہیں کرتے۔

واعظ حالاتِ حاضرہ کو دنیاوی باتیں قرار دے کر انہیں اصلاح کے قابل ہی نہیں سمجھتے۔ اگر مبلغین

اسلام سے دنیاوی باتوں کی تعریف پوچھی جائے آئیں بائیں شائیں کرتے ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی معاملہ ایسا نہیں جو مسجد میں یا مومنوں کی محفل میں زیر بحث نہ لایا جاتا ہو۔ اگر مسجد میں کوئی شخص کسی دوسرے کی خیریت بھی پوچھ لے تو نام نہاد مبلغینِ اسلام اسے دنیاوی بات کہہ کر شرمندہ کرنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے۔ سیاست حاضرہ نے لوگوں کو یہ سکھایا ہے کہ مسجد صرف عبادت کی جگہ ہے وہاں کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ ہم نے عبادت میں خدا کے واحد ہونے کی گواہی دی ہے اور خیر البشرؐ کے آخری نبی ہونے کی گواہی دینی ہے۔ وہ بھول جاتے ہیں کہ لوگوں کو فلاح کی طرف بلایا گیا ہے اور انہیں نماز کی طرف بلایا گیا ہے۔ لوگ مسجد میں اکٹھے ہو کر قیام بھی کرتے ہیں اور سجود میں بھی مگن رہتے ہیں مگر مسجد سے نکلتے ہی جب عملی زندگی میں داخل ہوتے ہیں تو ان میں مذہب کی کوئی رمق بھی نظر نہیں آتی۔

حرفے چند با امتِ عربیہ:۔

اقبال امتِ عربیہ سے بھی مخاطب ہوتے ہیں۔ امت کو یہ دعا دیتے ہیں کہ تیرے دشت دار ہمیشہ سلامت رہیں۔ پھر پوچھتے ہیں کہ بھلا یہ تو بتاؤ کہ سب سے پہلے کس نے نعرہ لا قیصر و کسری بلند کیا تھا؟ کس نے سب سے پہلے قرآن مجید پڑھا تھا؟ وہ کون تھا جس نے رمز الا اللہ لوگوں کو سکھائی تھی؟ یہ چراغ پہلے پہل کہاں روشن ہوا تھا؟ علم و حکمت کس کے دستر خوان کے ریزے ہیں۔ کس کی شان میں آیت سورہ آلِ عمران آیت 103 ''سو تم خدا کی نعمت سے آپس میں بھائی بھائی ہو گئے'' نازل ہوئی تھی۔

حُریت پروردۂ آغوش اوست — یعنی امروزِ امم از دوشِ اوست
او دلے در پیکرِ آدم نہاد — او نقاب از طلعتِ آدم کشاد
ہر خداوندِ کہن را او شکست — ہر کہن شاخ از نمِ او غنچہ بست
گرمئ ہنگامۂ بدر و حنین — حیدرؓ و صدیقؓ و فاروقؓ و حسینؓ (31)

ان نعتیہ اشعار میں اقبال نے یہ واضح کیا کہ حضورؐ کے طفیل عربوں کو اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ آپؐ نے آدم کے روشن چہرہ سے نقاب اٹھائی، آپؐ نے ہر پرانا بت توڑ ڈالا اور حضورؐ کی نمی سے ہر پرانی شاخ میں کلیاں پھوٹ گئیں۔ آپؐ ہی کے تربیت یافتہ افراد اور آپ کی حکمت عملی سے بدر و حنین جیسے معرکے رونما ہوئے۔ اقبال نے اس نعتیہ بند کا اختتام تغیر لفظی سے خواجہ عطار کے اس شعر سے کیا ہے۔

؎ حمد بیحد بر رسولِ پاک را — آں کہ ایماں داد مشتِ خاک را (32)

آپؐ کی ذاتِ گرامی بے حد تعریف کے لائق ہے کیونکہ آپؐ نے انسان کو ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔ اس کے بعد اقبال نے ملتِ عربیہ کو درسِ عمل دیا ہے۔

؎ حق تیرا برّ اں تراز شمشیر کرد   ساربان را راکب تقدیر کرد (33)

اقبال ملت عربیہ کو یاد دلاتے ہیں کہ ایمان لانے سے پہلے تمہاری حیثیت کچھ بھی نہ تھی۔ اللہ نے تمہیں شمشیر سے زیادہ کاٹ دار بنا دیا اور وہ لوگ جو صرف اونٹ چرانے والے تھے وہ تقدیر ساز بن گئے۔ انہوں نے نہ صرف اپنی قسمت بدل دی بلکہ دوسروں کی قسمتیں بھی بدل دیں۔ اقبال بڑی دردمندی سے امتِ عربیہ سے مخاطب ہوتے ہیں۔

؎ امّتے بودی، امم گردیدۂ   بزم خود را خود زہم پاشیدۂ (34)

اقبال نے عربیوں کو یاد دلایا کہ تم ایک امت تھے مگر اب مختلف قومیتوں میں تقسیم ہو چکے ہو۔ اس طرح تم اپنی جماعت کو خود ہی منتشر کر کے رکھ دیا ہے۔ تنبیہ کے طور پر اقبال نے فرمایا۔

؎ ہر کہ از بندِ خودی وارَست، مُرد   ہر کہ با بیگانگاں پیوست، مُرد (35)

جس نے بھی خودی کا دامن چھوڑا، اسے موت آ گئی۔ جو کوئی غیروں سے جا ملا تو سمجھو اس نے اپنی شناخت بھی گنوادی۔ آج ملتِ عربیہ کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ افرادِ ملت بے یقینی کے مرض میں مبتلا ہیں۔ عربوں کو خود پر اعتماد نہ رہا۔ پھر وہ اپنی خودی اور اپنی غیرت سے بھی بیگانہ ہیں۔ دوسروں کے دست نگر ہو کر زندگی بسر کرنا ان کی عادت بن گئی ہے۔ اس طرح انہیں اپنی ذاتی صلاحیتوں پر بھی اعتبار نہ رہا۔ وہ اپنوں کو نظر انداز کر کے دوسروں سے رابطے اور تعلقات بڑھانے لگے۔ ایسی قوم کبھی کسی قوم کی حیثیت سے زندہ نہیں رہتی۔ یہی ملتِ عربیہ کا المیہ ہے۔ ملتِ عربیہ کی سب سے بڑی غلطی یا سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ اس نے ترکوں کے خلاف فرنگ سے تعلق قائم کر لیا۔ وہ اس نتیجہ سے بے خبر تھے کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔ انگریز تو چاہتے ہی یہ تھے کہ اہلِ عرب ان کے ساتھ تعلقات استوار کر لیں تا کہ وہ اپنی قوت میں اضافہ کر کے دوسرے لفظوں میں یہ کہ ان کی طرف سے بے نیاز ہو کر ان لوگوں کو سیاسی موت مار دیں جن کے ساتھ اہلِ عرب کا از روئے اسلام بھائی چارہ قائم ہے اور فرنگ اس معاملے میں کامیاب ہو گیا۔ اقبال نے ملتِ عربیہ سے کہا تھا

؎ اے ز افسونِ فرنگی بے خبر   فتنہ ہا در آستینِ او نگر

از فریبِ او اگر خواہی اماں   اشترانش را ز حوضِ خود براں (36)

تو جو فرنگی کے سحر سے بے خبر ہے۔ اس کی آستین میں جو فتنے اور فساد پوشیدہ ہیں انہیں دیکھنے کی کوشش کر۔ اگر تو اس کے فریب سے بچنا چاہتا ہے تو اپنے حوض سے اس کے اونٹوں کو بھگا دے۔ یہ دو اشعار بطور خاص توجہ طلب ہیں۔

؎ تا ضمیرش راز دانِ فطرت است   مردِ صحرا پاسبانِ فطرت است (37)

جب تک اس کا ضمیر فطرت کا راز دان ہے وہ مردِ صحرا فطرت کا پاسبان ہے۔

؎ مردِ صحرا! پختہ تر کن خام را برعیارِ خود بزن ایام را (38)

اقبال نے عرب قوم سے مخاطب ہو کر کہا کہ اے عرب قوم اپنی کوتاہیوں کو دور کر کے خود کو پختہ تر کر اور موجودہ دور کو اپنے معیار پر پرکھ۔

؎ فطرت کے مقاصد کی کرتا ہے نگہبانی یا بندۂ صحرائی یا مردِ کہستانی (39)

صحرا اقبال کے ہاں ایک وسیع ''قطعہ ارض'' نہیں جس میں سفر کرنا بہت مشکل ہے۔ صحرا ایک استعارا ہے۔ زندگی بسر کرنے کا ایک خاص انداز ہے۔ صحرا علامت ہے۔ بے پایاں وسعتوں کی۔ تیز و تند جھونکوں کی اور ایک مسلسل سفر کی۔

صحرا اقبال کو بہت عزیز ہے۔ کیوں کہ یہاں زندگی مسلسل متحرک رہتی ہے۔ یہاں تگاپوئے دمادم ہے۔ یہاں بانگ رحیل گونجتی ہے۔ یہاں ریت کے ٹیلے پر آہو کا بے پروا خرام ہوتا ہے۔ الغرض یہاں سفر ہی سفر ہے۔ حرکت ہی حرکت ہے۔

پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق:۔

اس عنوان پر کتاب کا نام رکھا گیا ہے۔ یعنی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق''۔ اقبال نے اقوامِ مشرق کی کمزوریاں ایک ایک کر کے گنوائی ہیں۔ درسِ عبرت بھی دیا ہے۔ درسِ عمل بھی سمجھایا ہے۔ اقبال نے کہا کہ موجودہ حالات میں تمہیں کیا کرنا چاہیے۔ تمہارا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ تمہاری سرگرمیاں عمل کے کس سانچے میں ڈھل جانی چاہیں۔ کہتے ہیں:

؎ آدمیت زار نالید از فرنگ زندگی ہنگامہ بر چید از فرنگ (40)

نوعِ انسان فرنگیوں کے ہاتھوں بڑی ہی نالاں ہے۔ زندگی نے اہلِ فرنگ سے کئی ہنگامے کھائے ہیں۔ فرنگ نے انسانیت کو تباہ کر دیا ہے اور آدمیت اس کے ظلم کے ہاتھوں رو رہی ہے۔ مگر اقبال جہد و عمل، روشنی اور امید کے شاعر ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں حضرتِ انسان جن مشکلات میں گرفتار ہو گیا ہے وہ اس کی پیدا کی ہوئی ہیں اور آدمیت کے اندر جو چھپا ہوا غم اسے تڑپاتا رہتا ہے وہ اس کے ظلم و ستم کا نتیجہ ہے مگر مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں کیونکہ:

؎ یورپ از شمشیر خود بسمل فتاد زیر گردوں رسمِ لادینی نہاد (41)

یورپ تو اپنی تلوار ہی سے گھائل ہے۔ اس نے دنیا میں لادینی کی رسم کی بنیاد رکھ دی ہے۔ اقبال اقوامِ مشرق کو پیغام دیتے ہیں کہ:

ہر چہ می بینی زانوارِ حق است　　حکمتِ اشیا ز اسرارِ حق است
ہر کہ آیاتِ خدا بیند حُر است　　اصلِ ایں حکمت ز حکمِ اُنظُر است (42)

جو کچھ تو دیکھتا ہے وہ حق تعالیٰ کے انوار سے ہے۔ اشیا کی حکمت بھی حق کے رازوں میں سے ہے۔ جو خدا کی نشانیاں دیکھ لے وہ مردِ حر ہے۔ اس حکمت کی بنیاد حکم ''انظر'' ہے۔ اقبال ملتِ اسلامیہ کے قوانین کا فرنگ یعنی یورپ کے قوانین سے مقابلہ کرتے ہیں۔ وہ اقوامِ مشرق یعنی اسلامی اقوامِ مشرق سے کہتے ہیں کہ تمہیں تمہارے خدا نے حکم دیا ہے کہ نظامِ فطرت کا بغور مطالعہ کرو۔ اس سے تمہیں معلوم ہوگا کہ اس میں تمہارے لیے بے حد و حساب بصیرتیں ہیں۔ تم مطالعہ فطرت سے وہ حکم و بصائر سیکھ سکتے ہو جو یورپ کی مادہ پرست قومیں نہیں سیکھ سکتیں۔ اس مطالعہ سے تمہارے اندر ایک ایسا جذبہ روحانیت پیدا ہوسکتا ہے جس سے تمہارے بدن اور دماغ روشن اور تابناک ہوجائیں گے۔ یہ روشنی اور تابناکی یورپ کو کہاں نصیب؟ یہ دانش جو تم حاصل کرو گے، دانشِ روحانی ہے اور افرنگیوں کی دانش کچھ اور ہے۔

دانش افرنگیاں تیغے بدوش　　در ہلاک نوعِ انساں سخت کوش (43)

اہل مغرب کی دانش تو ایسے ہے جیسے کندھے پر تلوار۔ یہ نوعِ انساں کی ہلاکت کے درپے ہے۔ اقبال اس کی وجہ بتاتے ہوئے کہتے ہیں۔

عقل و فکرش بے عیارِ خوب و زشت　　چشمِ او بے نم، دلِ او سنگ دشت
علم از در سواست اندر شہر و دشت　　جبرئیل از صحبتش ابلیس گشت (44)

اس کی عقل اور فکر نے نیکی اور بدی کا امتیاز چھوڑ دیا اس کی آنکھ بے نم ہوگئی اور اس کا دل پتھر اور اینٹ کی طرح سخت ہوگیا۔ اس کی وجہ سے ابادی اور بیاباں میں علم رسوا ہوگیا۔ اس کی صحبت میں رہ کر جبرئیل پر بھی ابلیسیت کی چھاپ لگ گئی۔ یورپ کے علم کی یہ ''برکت'' ہے کہ یہاں جبرئیل بھی ابلیس بن جاتا ہے۔ یورپ دین سے بیزار ہوگیا ہے اور اس نے لادینی اختیار کرلی ہے۔ اس لیے اس کی ساری تگ و دو مادی ترقی تک محدود ہوکر رہ گئی ہے۔ انسانیت کے لیے اس کے دل میں کوئی درد نہیں رہا۔ آدمیت کے درد پر اس کی آنکھ سے ایک قطرہ اشک بھی نہیں گرتا۔ جب دل ہی پتھر اور اینٹ بن جائے تو اسے انسانوں کی بربادی سے کیا تعلق۔

اے کہ جاں را بازمی دانی ز تن　　سحرِ ایں تہذیب لادینے شکن
روحِ مشرق اندر تنش باید دمید　　تا بگردو قفلِ معنی را کلید (45)

تو کہ روح کو جسم سے الگ سمجھتا ہے۔ اس لادین تہذیب کے جادو کو توڑ دے۔ اس کے بدن میں مشرقی روح پھونکنی چاہیے تاکہ وہ عقل کے فضل کی چابی بن جائے۔ اس دور میں یورپ کے ایک مطلق العنان

(مسولینی) نے حبشہ پر حملہ کر دیا تھا۔اقبال نے بڑے دکھ بھرے انداز میں کہا تھا۔

؎ زندگانی ہر زماں درکش مکش عبرت آموز است احوالِ حبش

شرع یورپ بے نزاع قیل وقال برہ راک رداست برگرگاں حلال (46)

زندگی ہر لحہ کش مکش میں ہے۔حبشہ کے حالات عبرت آموز ہیں۔جب مسولینی نے حبشہ پر حملہ کیا تھا تو یورپ کے اقوام اس وقت بھی خاموش تھیں۔یورپ کی شرع نے کسی مقدمے اور دلیل کے بغیر میمنے کو بھیڑیوں کے لیے حلال قرار دیا ہے۔حبشہ کی حیثیت بھی ایک میمنے جیسی ہے اور اٹلی کا قصاب اس کی تکہ بوٹی کرنے پر تل گیا تھا۔اقبال جمعیتِ اقوامِ عالم سے مایوس تھے کیونکہ سفید فام قوموں نے اپنی ہی پالیسی جاری کر رکھی ہے۔

؎ در جنیوا چیست غیر از مکر وفن صیدِ تو ایں میش و آں نخچیر من (47)

مادہ پرست، بے رحم اور بے بصیر اقوامِ مغرب کیا کیا سوچتی ہیں۔وہ کہتی ہیں کہ یہ بھیڑ تمہارا شکار ہے اور وہ میرا شکار ہے۔اس کی سوچ ترکی میں بروئے کار آئی تھی۔ترکی کو ریزہ ریزہ کرنے کے بعد انہوں نے پورا ملک آپس میں بانٹ لیا تھا۔مثنوی ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' کا یہ پورا باب ہی درسِ عمل سے بھرا ہوا ہے۔اقبال نے بار بار اہلِ خاور کو آمادہ عمل کرنے کی کوشش کی ہے مگر آمادۂ عمل کرنے سے پہلے بتاتے ہیں کہ ہم کیا ہیں اور ہماری حیثیت کیا ہے؟

؎ ہم ہنر ہم دیں ز خاکِ خاور است رشکِ گردوں خاکِ پاکِ خاور است

وانمودیم آنچہ بود اندر حجاب آفتاب از ما و ما از آفتاب (48)

ہنر اور مذہب دونوں مشرق ہی کی سرزمین سے پیدا ہوئے۔مشرق کی پاک مٹی پر آسمان بھی رشک کرتا ہے۔ہم سورج سے ہیں اور سورج ہم سے ہے۔ہم نے ہر راز افشا کر دیا ہے۔ہر صدف کے اندر کا موتی مشرق کی بارش کے قطرے سے پیدا ہوا۔ہر سمندر کی شان وشوکت مشرق والوں ہی کے طوفان سے ہے۔ مشرق کی روح بلبل کے سوز میں بولتی ہے۔اقبال نے درسِ عمل یوں دیا ہے کہ:۔اے ایشیاء تو جو تہذیب اور دین کی دولت کا امین ہے۔یدِ بیضا اپنی آستین سے باہر نکال۔اٹھ اور قوموں کے معاملات کو سلجھا۔اور مغرب کا نشہ اپنے سر سے اتار پھینک۔اقبال نے اتحادِ مشرق کی بنیاد رکھی۔شیطان کے پنجے سے خود کو چھڑانے کی تلقین کی۔اور کہا:۔

؎ آنچہ از خاکِ تو رست اے مردِ حُر آں فروش و آں بپوش و آں بخور (49)

اے مردِ حر جو کچھ تیری زمین سے پیدا ہوتا ہے اسے بیچ وہی کچھ پہن اور وہی کچھ کھا۔اقبال نے بالِ جبریل میں لکھا:۔

؎ اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں　　سفالِ ہند سے مینا و جام پیدا کر (50)

اقبال کسی بھی حال میں مغرب کی تقلید پسند نہ کرتے تھے۔ اقبال کو یہ سہارا سخت ناپسند تھا جو کسی بھی ترقی کے لیے مغرب سے حاصل کیا جائے۔ اقبال ان لوگوں کو سمجھداروں میں شمار کرتے تھے جو اپنی لوئی یا گدڑی یا خرقہ بھی خود ہی تیار کرتے تھے۔

؎ چشم تو از ظاہرش افسوں خورد　　رنگ و آبِ او ترا از جا برد

دائے آں دریا کہ موجش کم تپید　　گوہرِ خود را زغواصاں خرید! (51)

تو جو اس دور کے معاملے سے بے خبر ہے ذرا یورپ کی کاری گریوں کو سمجھ۔ وہ تیرے ریشم سے قالین بنتا ہے پھر تیرے ہی سامنے اسے فروخت کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ تیرے یہاں ہی لا کر ڈال دیتا ہے۔ اس لیے اقبال نے کہا کہ لوگوں کی نگاہیں مغرب کے ظاہر سے دھوکا کھا رہی ہیں۔ مغرب کی ظاہری چمک دمک نے ان کے اپنے اصل مقام سے انہیں گرا دیا ہے۔ اقبال افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس سمندر کی موجوں میں اضطراب نہیں اس پر افسوس ہی کیا جا سکتا ہے۔ مغرب کا کردار تو آج غوطہ خور کا ہے اور ہم اس غوطہ خور سے موتی خرید رہے ہیں۔

درج بالا صفحات سے اقبال کے سیاسی افکار واضح ہوتے ہیں۔ اقبال حکمتِ کلیمی کے قائل تھے۔ اقبال کے نزدیک حکمتِ فرعونی دراصل ابلیسی چال ہے اور لوگ اس پر عمل پیرا ہیں۔ آج حکمتِ کلیمی کا اثر تقریروں اور کتابوں میں تو نظر آتا ہے مگر عملی طور پر اس کا اثر کسی پر دکھائی نہیں دیتا۔ وہ چند لوگ جو حکمتِ کلیمی اختیار کرنے پر زور دیتے ہیں ان کے گرد دائرہ حیات تنگ کر دیا جاتا ہے۔ معاشرے میں انہیں دقیانوس ہونے کا طعنہ دیا جاتا ہے۔ علما کرام اپنی لچھے دار تقریروں میں من گھڑت قصے بیان کرتے ہیں اور داد وصول کرتے ہیں نتیجہ کے طور پر عمل کی کوئی رمق بھی لوگوں میں نظر نہیں آتی۔ آج زور و شور سے عبادتیں تو کی جاتی ہیں مگر ان سے نہ دل بدلتے ہیں اور نہ حالات۔ لوگوں نے عبادتوں سے حلیہ بدلنے کا ہی درس حاصل کیا۔ داڑھیوں کی لمبائی چوڑائی کو دین کا حصہ بنا لیا۔ شلوار کو ٹخنوں سے اوپر کر لینے میں دین تراش لیا۔ اس سے خطرناک حملہ سیاست پر کیا گیا کہ اسے دین سے جدا کر دیا۔ ان حالات میں چنگیزی پروان چڑھی اور حکمتِ فرعونی نے اس کے لیے اکسیر کا کردار ادا کیا۔ اس حکمتِ فرعونی نے لوگوں کو روٹی، کپڑا اور مکان کی حدود میں بند کر دیا۔ انسان نے اس کے لیے بہت محنت شروع کر دی۔ اس عظیم بشرؐ کے پاس روئی کے خزانے نہ تھے۔ اس پر سلام بھیجنے والے جانتے ہیں کہ وہ خیر البشرؐ چاندی اور سونے کے خزانے نہ رکھتا تھا۔ اس کا بچھونا تو ٹوٹا ہوا بوریا ہوا کرتا تھا۔ آج ہم حضرت محمدؐ کی تعریف میں رطب اللسان رہتے ہیں مگر عملی طور پر اسوہ حسنہؐ پر عمل پیرا نہیں ہیں۔ ہم آپؐ کے مزار کی جالیوں کی مدحتوں میں مگن رہے اور ہمارا دشمن ''مغرب'' اور ''امریکہ'' حکمتِ فرعونی کا سہارا لے کر ہمارے چمن میں خزاں کا جال بچھا گیا۔

حکمتِ فرعونی کا سب سے زیادہ، فائدہ سیاسیاتِ حاضرہ کو ہوا۔ حکمتِ فرعونی نے مذہب کو سیاست سے علیحدہ کرنے میں جو کردار ادا کیا۔ اس کے اثرات عوام میں آسانی سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ چراغِ مصطفویؐ سے لوگوں نے حبِ رسولؐ اخذ کیا مگر آپؐ نے جو عملی کردار ادا کیا اور جو عظیم الشان کردار ادا کیا اسے ہم نے پس پشت ڈال دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری سیاست کا قبلہ الٹ گیا۔ آج کہا جاتا ہے کہ سیاست گند کا ڈھیر ہے۔ دین دار افراد کے دل میں یہ بات ڈال دی گئی کہ گند میں پتھر مارنے سے اپنے ہی کپڑے خراب ہوں گے۔ کوئی ان حکمتِ فرعونی کے ماننے والوں سے یہ تو پوچھے کہ پھر اس خرابی کا خاتمہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ افسوس کی بات تو یہ ہے کہ حکمت فرعونی سے متاثر ہو کر اسے اپنانے والے یہ بھی نہیں مانتے کہ ان کی سوچ غلط ہے بلکہ صاحبانِ تقویٰ کو شرمندہ کرتے ہیں۔ آج علماء کی خدمت کرنے پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔ اگر کوئی عالم عوام کو بیدار کرنے کی کوشش کرے تو اس کا راستہ روکنے کے لیے کہہ دیا جاتا ہے کہ سیاسی باتوں سے گریز کیا جائے۔ گویا سیاسیاتِ حاضرہ کے علمبردار ہر ممکن کوشش کرتے ہیں کہ عوام خوابِ غفلت میں ڈوبے رہیں۔ اس طرح قوم غلام بن جاتی ہے اور سیاست کے بت اپنی دکان داری سجا لیتے ہیں۔ عربوں کی حالت بھی عجیب ہے۔ خدا نے انہیں تیل کی دولت سے نوازا۔ یہ قوم علم و دانش کے اعلیٰ مقام تک پہنچی مگر مغرب نے انہیں عیش و آرام کا درس دیا اور ان کے وسائل پر قبضہ کر لیا۔

ان حالات میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ وہی جو اقبال نے ''پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق'' میں کہا مغرب نے دنیا میں جو لادینی کی فضا قائم کی، اس کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اپنی صفوں سے بھیڑیا صفت امریکی اور مغربی افکار سے متاثر افراد کا راستہ روکنا ہوگا۔ اپنے وجود کو علم کے نور سے منور کرنا ہوگا تاکہ ہمارے دل میں خدا کا خوف جاگزیں ہو سکے۔ اہلِ مغرب کی لادین فکر سے لوگوں کو آگاہ کرنا چاہیے۔ اس لادین تہذیب کے جادو کو توڑنا ہوگا۔ جمعیتِ اقوام نے حبشہ کے معاملے میں بھی کوئی کردار ادا نہ کیا تھا۔ آج مشرق کی آبرو ہمارے ہی ہاتھ میں ہے۔ اگر ہم نے سنجیدگی سے غور نہ کیا تو ہماری داستان بھی دنیا کی داستانوں میں نہ رہے گی۔ تاریخ ہمیں ایسا سبق سکھائے گی کہ ہم گر کر دوبارہ ابھرنے کی حالت میں نہ رہیں گے۔

حواشی

1۔ رفیع الدین ہاشمی، ڈاکٹر؛ تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ (لاہور۔ اقبال اکادمی پاکستان) طبع دوم 2001ء، صفحہ 163
2۔ اقبال، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، جلد چہارم، مرتبہ، سید مظفر حسین برنی (دہلی۔ اردو اکادمی) سن اشاعت 1998ء، صفحہ 321
3۔ صہبا لکھنوی، اقبال اور بھوپال (لاہور۔ اقبال اکادمی پاکستان) طبع دوم اکتوبر 1982ء، صفحہ 214
4۔ اقبال۔ کلیاتِ مکاتیبِ اقبال جلد چہارم، مرتبہ، سید مظفر حسین برنی، صفحہ 343
5۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، شرح، پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، زبورِ عجم (لاہور۔ مکتبہ دانیال) س ن، صفحہ 502
6۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم (لاہور۔ اقبال اکادمی پاکستان) اشاعت ششم 2004ء، صفحہ 522
7۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق (لاہور۔ شیخ غلام علی اینڈ سنز) س ن، صفحہ 801
8۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، بس چہ باید کرد، صفحہ 801
9۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، بس چہ باید کرد، صفحہ 803
10۔ اقبال، کلیات اقبال فارسی، شرح، پروفیسر حمید اللہ شاہ ہاشمی، پس چہ باید کرد، صفحہ 911
11۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، بانگ درا، صفحہ 128
12۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم، صفحہ 501
13۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، ضربِ کلیم، صفحہ 503
14۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، بالِ جبریل، صفحہ 396
15۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 808
16۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 808
17۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 809
18۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 809
19۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، بانگ درا، ارتقاء، صفحہ 251
20۔ اقبال کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 811
21۔ اقبال کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 811
22۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، بانگِ درا، طلوعِ اسلام، صفحہ 305
23۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 831
24۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، خضرِ راہ، سلطنت، صفحہ 290
25۔ اقبال، کلیاتِ اقبال فارسی، پس چہ باید کرد، صفحہ 832
26۔ اقبال، کلیاتِ اقبال اردو، بانگ درا، خضرِ راہ، سرمایہ و محنت، صفحہ 291

27۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 832
28۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،ہ833
29۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 833
30۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 834
31۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 835
32۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 836
33۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 836
34۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 837
35۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 837
36۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 837
37۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 837
38۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 838
39۔اقبال،کلیاتِ اقبال اردو،ضربِ کلیم،محراب گل افغانی کے افکار(20)،صفحہ 691
40۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 839
41۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 839
42۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 839
43۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 840
44۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 840
45۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 840
46۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 841
47۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 841
48۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 841
49۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 843
50۔اقبال،کلیاتِ اقبال اردو،بالِ جبریل،جاوید کے نام،صفحہ 477
51۔اقبال،کلیاتِ اقبال فارسی،پس چہ باید کرد،صفحہ 843

☆ڈاکٹر محمد عامر اقبال،اسسٹنٹ پروفیسر،یونیورسٹی آف سیالکوٹ،پنجاب،پاکستان(00923015516347)
☆☆پروفیسر عبدالحق،پروفیسر ایمرطس،شعبہ اردو،دہلی یونیورسٹی،دہلی(00919350461394)

ڈاکٹر محمد نفیس حسین
دریا گنج نئی دہلی

اقبال اور خطاب بہ جوانانِ اسلام

یوں تو اقبال کی فکر پیام اور کلام کا محور پورے عالمی انسانیت کا ہر فرد ہے لیکن اپنے فکر و پیام کی ترسیل اور کلام کی طرف جس طبقے کو انہوں نے سب سے زیادہ اپنا مخاطب بنایا ہے وہ ہے نوجوان! بالخصوص مردِ مسلماں نوجوان۔ اس لیے لیے کہ عہدِ شباب انسانی زندگی کا وہ دور ہے جس میں جوش و جذبات، ہیجان و اضطراب، ولولہ و امنگ، عزم بلند، قوت و شان اور علم و عرفان کا عنصر سب سے زیادہ ہوتا ہے نوجوان ہی کسی حیات افروز اور انقلاب آفریں پیغام کے متحمل اور انقلاب کو بروئے کار اور روبہ عمل لانے میں پیش پیش ہوتے ہیں۔

ہم بخوبی واقف ہیں کہ اقبال کا عہد مشرقیت و مغربیت کی کشمکش کا نقطۂ عروج ہے۔ مغرب کے نئے نئے علوم و فنون سے سرشاری اور ذوقِ عمل کی طرف پیش قدمی کا عہد ہے نئی تہذیب و ثقافت، حکومت و سیاست اور انقلابی نظریات کا عہد ہے۔ دوسری طرف مشرقی اقوام و ممالک کی ذوقِ عمل سے دوری، زبوں حالی اور شکست خوردگی ہے۔ ملتِ اسلامیہ نیز وطن عزیز ہندوستان میں سامراجی طاقت اور ملک کی غلامی کا عہد ہے۔ یہی وہ ماحول ہے جس نے ایک باشعور و حساس اور دردمند صاحبِ دل اقبال کو اپنی زندگی کے کسی دور میں بھی چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ اپنے وطن عزیز کے علاوہ اسلام کی عظمت رفتہ کا شدید احساس تھا۔ نکبت و ادبار کی موجودہ فضا میں وہ اپنی عظمتِ رفتہ کے دم واپسیں کے لیے مستقل ملول و مضطرب اور کوشاں رہے۔ ان کے فکر و پیام اور کلام کی سرگزشت اسی گم شدہ متاعِ عزیز میں از سرِ نو تلاش و جستجو اور آتش رفتہ کا سراغ ہے۔ اپنے کاسۂ فکر و پیام کے اسی اثاثے متاعِ فقر کو وہ اپنے اہل وطن و قوم میں انڈیلنے کے آرزومند رہے۔ خاص طور پر نوجوان نسل سے انہیں بڑی امیدیں تھیں۔ اسی لیے نوجوان کو وہ کبھی ''شاہین بچے'' سے خطاب کرتے ہیں۔ کبھی ان کا روئے سخن طلبا علی گڑھ کالج کے نام ہوتا ہے کبھی اپنے دوست عبدالقادر کے نام نیز ہر باشعور، حساس اور صاحب قلب و نظر کی طرف اسی اضطرابِ پیہم کے ساتھ پیام بردار نظر آتے ہیں۔ کبھی لالۂ صحرائی سے ہم کلام ہوتے ہیں کبھی حضور رسالتِ مآبؐ میں یہ دلِ مضطرب رسائی حاصل کرتا ہے۔ شاہیں بچے میں وہ قوتِ پرواز، جہاں گردی و جہاں بینی، بلند نگاہی اور غیرت و خودداری کے متلاشی، لالۂ صحرائی کے رنگ و حال میں وہ اس کے جگرِ سوختہ، جگر کاوی، صحرانوردی اور حسن و کمال کی پرورش اور عشق و سرمستی کے جویا نظر آتے ہیں۔

خدایا آرزو میری یہی ہے — توان شاہیں بچوں کو بال وپر دے
بھٹکا ہوا راہی تو ، بھٹکا ہوا راہی میں — نزل ہے کہاں تیری اے لالۂ صحرائی
اٹھ کے پیدا ہوئی ظلمت افقِ خاور پر — بزم میں شعلہ نوائی سے اُجالا کردیں
اوروں کا ہے پیام اور میرا پیام اور ہے — عشق کے درد مند کا طرزِ کلام اور ہے
طائرِ زیرِ دام کے نالے توسن چکے ہو تم — یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے

یہ اضطرابِ پیہم کبھی انہیں شکوہ (۱۹۰۹) کرنے پر مجبور کرتا ہے کبھی وہ ہنگامۂ زمانہ کی گرانی کے باعث حضور رسالتِ مآبؐ میں امتِ محمدیہؐ آبرو کا آبگینہ جس میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو ہے ۔ (جنگِ بلقان ۱۹۱۶) نذر کرتے ہوئے حاضر خدمت ہوتے ہیں کبھی وہ شمع وشاعر (۱۹۱۲) میں شمع سے اپنا دلِ زار اور شمع کی زبانی شاعر (یعنی قومِ مسلم) کی زبوں حالی کا مرثیہ خواں دکھائی دیتے ہیں ۔ یہاں بھی ان کی زبانِ حال وقال سے سرگزشتِ ملتِ بیضا اور اسلام کی عظمت رفتہ کے نغمے پھوٹتے ہیں اور ان کا قلبی اضطراب شمع کی زبانی یہ پُرسوز احساس نظم کراتا ہے ۔

وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا — کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

لیکن اسی رنجیدہ فضا میں امید ویقین کو بھی ابھارا جاتا ہے!

شام غم لیکن خبر دیتی ہے صبح عید کی — ظلمتِ شب میں نظر آئی کرن امید کی

چنانچہ وہ مرض کی تشخیص وعلاج کے طور پر قوم وملت کو اجتماعیت ربطِ باہمی اور خودی کا پیغام سناتے ہیں ۔

فرد قائم ربط ملّت سے ہے تنہا کچھ نہیں — موج ہے دریا میں اور بیرونِ دریا کچھ نہیں
وائے تا دانی کہ تو محتاج ساقی ہوگیا — مے بھی تو مینا بھی تو ، ساقی بھی تو ، محفل بھی تو

پس وہ قوم وملت کے ہر فرد کو جوہرِ آئینہ ایام اور خدا کے آخری پیغام کا روشن پیکر بنا کر پیش کرتے ہوئے امید افزا مستقبل کی صبح نمودار ہونے کی بشارت بھی دیتے ہیں ، اسی پرنور وپرامید فکر وپیام کے ساتھ نظم کا اختتام ہوتا ہے ۔

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے — یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

نظم ''مسلم'' (۱۹۱۲) میں بھی یہی سوز وگداز کی کیفیت ہے یادِ عہد رفتہ کو وہ اپنی خاک کے لیے اکسیر اور اپنے اس عہد ماضی کو وہ اپنے مستقبل کی تفسیر خیال کرتے ہیں اور موجودہ زبوں حال صورت حال سے دل برداشتہ ہونے کے بجائے آئینہ فردا میں ماضی کے دورِ نشاط افزا کا نظارہ کرتے دکھائی دیتے ہیں ۔ ان کے کلام میں لفظِ مسلم ، جوانانِ مسلم ، ملتِ اسلامیہ وغیرہ کی تکرار بلاشبہ قرآن مجید میں اہل ایمان کے شعار وصفات اور ان کے مقام ومرتبت کی ترجمان محسوس ہوتی ہے ۔

''خطاب بہ جوانانِ اسلام'' بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ دردِ دل اور سوز وگداز کی شدید کیفیت سے لبریز یہ نظم بھی بانگِ درا کے حصہ سوئم اور تقریباً ۱۹۱۵ کے آس پاس کہی جانے والی نظموں میں سے ہے۔ ۱۲،۱۹۱۱ کے دوران چونکہ دنیائے اسلام پر جس طرح نکب وادبار کے بادل چھائے ہوئے تھے اور ہزیمت وشکست ان کا مقدر ہو چکی تھی۔ ۱۹۱۶ کی پہلی جنگ عظیم اور جنگ بلقان، خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ وغیرہ وہ حالات تھے جن کی مغموم فضا میں اقبال دردمندی ودل سوزی کے عالم میں قوم کے نوجوان کو خطاب کرتے ہیں اور خطیبانہ رنگ سخن میں وہ انہیں اپنی عظیم تاریخ اور آتش رفتہ کا سبق یاد دلا کے ان میں جوشِ حرکت وعمل اور خودی کی تعمیر نو کا ولولہ انگیز پیغام دیتے ہیں۔

غزل کی ہیئت میں یہ نظم ۱۱+۱۱۱ اشعار پر مشتمل ہے یعنی گیارہ اشعار پر نظم ختم ہو جاتی ہے اور بارہواں شعر بطور تضمین ہے۔ ملاّ محمد غنی کاشمیری کے شعر سے تضمین بھی اقبال کا خاص رنگ ہے۔ اکثر نظموں اور بعض جگہ غزلوں میں وہ کسی معروف شاعر کے اپنے پسندیدہ مصرعہ شعر یا اشعار (اردو/فارسی دونوں) کو بطور تضمین پیش کرتے ہیں۔

اس نظم کے ابتدائی پانچ اشعار میں اسلامی تاریخ کے کئی اہم گوشوں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ نبی آخرالزماںؐ کے دربارِ رسالت کے تربیت یافتہ سادہ لوح صحرا نورد اصحاب باصفا، مردانِ حُر، خیرالامت لقب عظیم سیرت وکردار کے حامل اوران کے نقوشِ فکر وعمل سے عالمِ انسانیت کی ایک نئی صبح نمودار ہوئی۔ اقبال نوجوانوں کو ان کی نمایاں صفات سے ازسرِ نو واقف کراتے ہیں۔ اے نوجوانِ مسلم! آسمانِ نبوت کے یہ وہ ستارے تھے جن کا ایک ٹوٹا ہوا ستارہ تو ہے تو بھی وہی فردِ فرید ہے کیا تو نے کبھی اس حقیقت پر تدبّر، غور وفکر کیا؟ اس استفسار کے بعد خود ہی انہیں آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے نوجواں! تو اسی امتِ مسلمہ کے آغوشِ محبت کا پرورش کردہ ہے جس نے اپنے قدموں تلے تاجِ سردار کو کچل ڈالا تھا۔ یعنی وہ فاتح عالم تھے۔ انہوں نے دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو آئین اسلام کے حُسن اخلاق اور جرأتِ کردار کی بدولت فتح کر کے عالم انسانیت اور انسانی تاریخ میں اپنا نقش ثبت کیا تھا۔ تاریخ اسلام کے صرف ایک اہم واقعے کی طرف اشارہ کر کے اقبال نوجوانوں کے تنِ مردہ میں حیاتِ تازہ پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ دارِقدیم ایران کا وہ مشہور بادشاہ ہے جس کو سکندر اعظم نے 328 ق م میں شکست فاش دی تھی۔ ایک عرصے کے بعد اسلام کے انہیں مردانِ حُر نے مملکت ایران اپنے جھنڈے گاڑے اور تاجِ سردار کو اپنے قدموں تلے روندھ ڈالا یعنی خلیفۂ دوم حضرت عمر فاروقؓ نے اپنے عہد خلافت میں 15 ھ میں ایران کو فتح کیا۔ یہ عظیم فتح کسی مملکت، تخت وتاج اور دولت وشوکت کی نہ تھی بلکہ اسلام کے آئین توحید ورسالت اور تہذیب وثقافت کی فتح تھی۔ ان کی فتوحات کا سلسلہ ملک گیری نہ تھا، اصل مقصد اللہ کی سرزمین پر اللہ کی وحدانیت، پیغام رسالتؐ اور احترام ومساوات انسانیت تھا۔ اللہ کی رضا کا حصول

اوراس کا خوف وخشیت تھا۔ یہ فتوحاتِ ارضی محض اسی عظیم مقصد کے تحت تھیں کہ انسانوں کوانسانوں کی غلامی سے نکال کرایک الٰہِ واحد کی بندگی وعبادت میں اورانہیں انسانوں کے خوف وظلم اور جبر واستبداد سے نکال کراللہ کے خوف وخشیت اور دامنِ رحمت میں لایا جائے۔ سرزمین عرب جولق ودق صحرا کی سادہ وجفاکش جنگجو یانہ زندگی اور صحرانوردشتر بانوں (اونٹ سواروں) کا گہوارہ تھی وہاں کے لوگ کسی چمک دمک، عیش وطرب اور مصنوعی زندگی سے واقف ہی نہیں تھے لیکن بدوؤں کی اسی صحرانورد قوم نے جب دربارِ رسالتؐ کی آغوشِ مبارک میں عظیم تربیت حاصل کی تو وہ ذرہ بےمقدار سے گوہر نایاب ہوگئے۔ آپؐ کی تربیت وتعلیم نے انہیں تمدن آفریں اور خلّاقِ آئینِ جہاں داری بنادیا۔ انہوں نے دنیا کو تہذیب وتمدن، اخلاق ومعاشرت، سلطنت ومملکت اور حکومت وسیاست کے طور طریق اور بنیادی اصول وقوانین سے روشناس کرایا۔ دنیا نے دیکھا کہ تہذیب وتمدن کسے کہتے ہیں اور حکومت سازی ومملکت کے اصول وضوابط کیا ہونے چاہیے۔ ان کی شانِ امارت وحکومت کی بنیادی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں ''الفقر فخری'' کا نظارہ تھا۔ یعنی حضور رسالتؐ کی زبان مبارک سے انہیں فقر وفاقہ کشی کی زندگی بسر کرنے کی تعلیم ملی تھی۔ خود بھوکا رہ کر دوسروں کا پیٹ بھرنے، اپنی ضروریات کے باوجود دوسروں کی ضرورت کو مقدم رکھنے اپنے حال سے صرفِ نظر اور بےخبر رہ کر دوسروں کی خبر گیری کرنے کا لافانی ولاثانی درس انہیں بارگاہِ نبوت ورسالتؐ سے ملا تھا۔ انہوں نے اپنی شانِ امارت وحکومت، مال ودولت اور شان وشوکت کی موجودگی میں بھی اسی بنیاد کو اپنایا اور اسی پر قائم ودائم رہے۔ عیش وعشرت کی فراوانی اور ساز وسامان کی کثرت کے باوجود سادگی وفاقہ کشی ان کا شعار رہا۔ اپنے اس خیال کی خوبصورت تکمیل کے لیے اقبال نے خواجہ حافظ شیرازی کی غزل کے ایک خوبصورت مصرعے کو بطور تضمین پیش کیا۔ کسی حسین چہرے کو اپنے حسن وجمال کے اظہار کے لیے کسی میک اپ اور رنگ، خط وخال تل وغیرہ کی مطلق ضرورت نہیں ہوتی۔ ان کی زندگی کا ایک حصہ تو یہ تھا جہاں شانِ امارت میں بھی الفقر فخری کا نظارہ تھا۔ اب ان کی زندگی کی دوسری تصویر وہ یہ کہ غربت وناداری کے عالم میں بھی وہ اللہ والے بڑے مردان باکمال تھے۔ نہایت غیور، غیرت مند اور خوددار تھے۔ ان کی غیرت خودداری بھی درجۂ کمال کی تھی۔ شدید تر غربت وناداری کی حالت کے باوجود ان کی یہ حالت کسی منعم ومالدار شخص پر ظاہر ہوجائے۔ کسی بھی قیمت پر یہ ممکن ہی نہ تھا۔ کوئی بھی منعم ومال دار شخص ان کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ وہ مردِ غیور ان کے درِ دولت پر حاضر ہو کر کسی بخشش وعطا کی درخواست کریں گے۔ نہ ہی کوئی دولت مند شخص ان غیور وغیرت مندوں کے رعب وجلال کے سبب کسی قسم کی بخشش کا کوئی حوصلہ دے سکتا تھا۔ اب ان کی نمایاں صفات وخصوصیات کی آخری بات کہی جارہی ہے۔ مختصر یہ کہ وہ صحرانشیں بظاہر سادہ ومعمولی حیثیت کے لوگ تھے لیکن اسلام کی آغوش میں تعلیم وتربیت پاکر وہ کیا سے کیا ہوگئے۔ جہاں گیر، جہاں دار، جہاں بان اور جہاں آرا۔ انہوں نے دنیا کے ملکوں کی صرف فتوحات حاصل نہیں کیں بلکہ

حکومت بھی کی حکومت کی نگہبانی بھی کی اور دنیا کے حکومت کے اس منصب امانت کو نہایت حسین اور حسن وخوبی کا نمونہ بھی بنایا۔ان کی بے شمار صفات میں س ے بس چند صفات کو میں بیان کیا ہے۔ میں چاہوں تو ان کی ایک ایک خصوصیت کا الفاظ میں نقشہ کھینچ کر رکھ دوں لیکن دنیا نے ان کے حسن وکمال کا جو نظارہ دیکھا اس کو بہ تمام وکمال بیان کرنا میرے تخیل میرے فکر وخیال سے بہت بلند ہے۔ میں اپنی سخنوری، زورِ بیان اور غیر معمولی اسلوبِ اظہار کے باوجود ان کی جملہ صفات وخصوصیات کو بیان نہیں کرسکتا۔اب نظم کے آخری پانچ اشعار میں وہ چشم تاسف کے آخر قطرے ٹپکاتے ہوئے گریہ کناں ہوتے ہیں۔اپنے ماضی سے اپنے حال کا موازنہ کرتے ہیں۔اے نوجوانوں اب تم اپنے آباءواجداد سے ذرا اپنا موازنہ کرو۔افسوس صد افسوس تجھ میں اور ان میں دور تک کوئی نسبت نہیں ان کی روشنی وتابندگی کی کوئی رمق کوئی کرن تیرے اندر نظر نہیں آتی۔تو بس باتیں ملاناڈینگیں ہانکنا جانتا ہے تو محض گفتار کا غازی ہے جب کہ وہ سراپا کردار، بہترین سیرت، نہایت روشن تہذیب واخلاق اور علم وعمل کا پیکر تھے۔ان کا ہر قول ان کا ہر عمل حق کے لیے تہہ تیغ تھا۔وہ راہِ حق میں تن من دھن کی بازی لگا دینے والے مردِ مجاہد تھے اور تو بے عملی بے کرداری اور جمود وتعطل کا شکار ہے۔تو ثابت وہ سیارہ۔افسوکہ ہم نے اپنے اسلاف ماضی کے ان تابندہ ودرخشندہ ستاروں سے جو ہر کردار وعمل کی جو میراث پائی تھی ہم وہ سب گنوا بیٹھے ۔ہمارے پاس اب کچھ بھی تو نہیں ہے ہم کہاں سے کہاں آ گئے ۔ ہمارے اسلام کی بلندی تو اوج ثریا تک تھی ۔انہوں نے بلندیوں کی تمام منازل طے کرلی تھیں۔انہوں نے ہمارے لیے بہترین میراث چھوڑی تھی۔افسوس ہم نے سب کچھ ضائع کردیا۔وہ بلندیوں کے جس اعلی وارفع مقام تک فائز تھے ہم اسی قدر زمین کی پستیوں میں گرے۔ہمارے ماضی کا یہ مرثیہ صرف اس حکومت وامارت کا نہیں جسے انہوں نے سر کیا تھا۔اس لیے کہ حکومت وامارت اور شانِ مملکت تو محض ایک عارضی شی ہے۔وہ کس کے پاس مستقل رہتی ہے۔انسانی تاریخ کی یہ ایک مسلم حقیقت بھی ہے مجھے اس کے چلے جانے کا ملال نہیں۔اصل ملال اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ ہمارے اسلاف نے علوم وفنون کے جو دریا بہائے تھے اور علم کے سمندر کی تہہ سے جو گوہر نایاب نکال کر اپنی بیش قیمت تحریروں، کتابوں اور کتب خانوں کی شکل میں ہمیں عطا کیے تھے، ہماری نااہلی وناقدری کے سبب ہمارے علم وفن کا وہ عظیم سرمایہ بھی اب ہمارے ہاتھ سے چلا گیا۔دنیا بھر میں ہمارا جو علمی وفنی سرمایہ تھا۔قیمتی ذخیرہ تھا دشمانانِ اسلام کی گود میں جا گرا۔

اسکندریہ کا عظیم کتب خانہ، ٹیپو سلطان کا کتب خانہ اور نہ جانے کتنے بیش بہا کتب خانے جو آج ہمارے نہیں بلکہ یورپ کے کتب خانوں کی زینت ہیں اپنی یہ علمی وفنی میراث جب ہم یورپ میں دیکھتے ہیں تو بے اختیار ہمارا دل پارہ پارہ ہوجاتا ہے۔بس اسی شعر کے ساتھ نظم کا بظاہر اختتام ہوجاتا ہے۔اور اقبال اپنے شدید قلبی تاسف اور چشمِ نم کے ساتھ اپنے مخاطب نوجوانانِ اسلام سے رخصت ہوتے ہیں اب غنی کاشمیری کے

شعر کو بطور تضمین غنی کی زبانی اپنے جذبہ واحساس کی آخری بات کہتے ہوئے یوں رخصت ہوتے ہیں۔حضرت یعقوبؑ نے اپنے نورِنظر حضرت یوسفؑ کی جدائی کے غم میں مستقل روتے روتے اپنی آنکھوں کی روشنی تک گنوادی لیکن ان کے نورِنظر عزیز مصر کی بیوی زلیخا کی آنکھوں کو روشن کر دیا۔زلیخا کو یوسف جیسا عظیم وحسین انسان مل سکا یعنی ہم تھے اپنے اسلاف کے کارناموں کی قدر نہ کر سکے لیکن اغیار یورپ نے ہمارے ان عظیم اور شاندار کارناموں سے بے پناہ روشنی حاصل کی۔یورپ کی ساری علمی وتہذیبی ترقی ہمارے ہی اسلاف کی مرہونِ منت ہے۔

فکروخیال کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی یہ نظم آج بھی ہمیں دعوتِ غوروفکر وعمل دیتی ہے اور اس وقت تک دیتی رہے گی جب تک ہمارے تن مردہ میں جان نہ پیدا ہو جائے اور اہم اپنی عظمت رفتہ اور فردوسِ گم شدہ کی بازیافت نہ کرلیں۔دریاعشق میں اپنا مقام نہ پیدا کرلیں اور افکارِتازہ سے کوئی جہانِ تازہ نہ پیدا کرلیں۔اس لیے کہ دلِ زندہ کی بیداری وآفرینی ہی قوموں کے ہر مرض کا علاج ہے۔

یہ فن پارہ اقبال کے اردو کلام بانگِ درا (۱۹۲۴) کا نقشِ اول ضرور ہے لیکن یہی وہ مضبوط خشتِ اوّل بھی ہے جس پر بالِ جبریل (۱۹۳۵) ضربِ کلیم (۱۹۳۶) ارمغان حجاز (۱۹۳۸) کی بلندیوں کو چھوتی ہوئی عمارت تعمیر ہوئی۔اوران کے فنی شہ پارے بھی دنیائے شعروادب کا نیا ارمغان ثابت ہوئے۔فکروفن کے اس مقام پر بھی اگر اسی خطاب پہ نوجوانانِ اسلام کو سامنے رکھا جائے تو ذرا اندازہ کیجیے۔تاجِ سردار، الفقر فخری، خلاقِ آئین جہاں داری، جہاں گیر وجہاں دار وجہانبان وجہاں آرا، آئین مسلم وغیرہ محض نادر تراکیب ہی نہیں ان میں تہذیبی، سیاسی اور اسلامی تاریخ کی تلمیحات کا جہاں بھی آباد ہے۔ایک ایک لفظ کی تفسیر کے لیے علم ومطالعے کا ایک دفتر درکار ہے۔طرزِ ادا میں نغمہ وآہنگ، غنائیت، جوشِ جذبات، رفعت تخیل وغیرہ بھی بدرجۂ اتم ہے۔نئی لفظیات، بندشیں، تراکیب، قرآنی آیا وواحادیث مبارکہ عالمی صورتِ حال، بالخصوص عالم اسلام اور اسلامی تاریخ پرانی کی وسیع وعمیق نظر، حال کا گہرا مشاہدہ اور دل سوزی ودل گدازی کی لطیف کیفیات، نادر تشبیہات واستعارات، علامات وتلمیحات اور جملہ محاسن شعری صنائع وبدائع کا فن کارانہ استعمال بلاشبہ اردو شعر وادب کی نئی آواز، نئے اسالیب اور نئے جہان معنی کی سیر کراتا ہے۔ان کے کلام سے شاعری اور اس میں فکر وپیام کی فلسفیانہ آمیزش کے متعدد نئے گوشے اردو شعروادب کو فراہم کرتے ہیں۔فن کی عظمت اور شعروسخنور میں فن کے تقاضوں کو برتنے اور بروئے کار لانے کا احساس بھی دلاتے ہیں ان کے فکروپیام اور فن میں ان کے دل دردمند اور اخلاص وایثار کا نہاں خانہ ہے جو ان کے فن اور تصور فن دونوں میں ابدیت کے نقوش ثبت کرتا ہے اور واقعی یہ احساس دلاتا ہے کہ ان کی نوا کی پرورش خونِ دل وجگر سے ہوئی ہے اور ان کے فن میں ابدیت کے گہرے نقوش ثبت ہیں۔فکروپیام اور فن کا یہ مقام بلند ہی اقبال کی منفرد پہچان ہے۔

ڈاکٹر صدف نقوی

تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ

قرآن ایک ایسی کتاب ہے جو فکر کی نسبت عمل پر زیادہ زور دیتی ہے تاہم ایسے لوگ ہیں جن کے لیے خِلقی طور پر یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ ایک حیاتی طریقِ عمل کے طور پر اُس مخصوص قسم کے باطنی تجربے کو جس پر آخر الاَمر مذہبی عقیدے کا دارومدار ہے، نئی زندگی کا حصہ بناتے ہوئے ایک کائنات کو اپنے اندر جذب کر لیں۔ مزید براں دورِ حاضر کے انسان نے ٹھوس فکر کی عادات، وہ عادات جن کی خود اسلام نے کم از کم اپنے ثقافتی سفر کے ابتدائی مراحل میں پرورش کی تھی، اختیار کر لینے سے اپنے آپ کو اُس تجربے کی کم صلاحیت رکھنے والا کر دیا ہے کہ جس (تجربے) کو وہ اس کے التباس میں بدل جانے کے امکان کے باعث شک کی نظروں سے بھی دیکھتا ہے۔ بلاشبہ تصوف کے نسبتاً زیادہ مستند مکاتیبِ فکر نے اسلام میں مذہبی تجربے کے ارتقا کی صورت پذیری کرنے اور (اس کا) رخ متعین کرنے میں عمدہ کام انجام دیا ہے مگر ان کے عہدِ حاضر کے نمائندے جدید ذہن سے اپنی ناواقفیت کی بنا پر جدید فکر و تجربہ سے کوئی تازہ تحریک حاصل کرنے کی صلاحیت سے مکمل طور پر عاری ہو گئے ہیں۔ وہ اُن طریقوں کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جو اُن نسلوں کے لیے وجود میں آئے تھے جو ثقافتی نقطۂ نظر کے اہم پہلوؤں میں خود ہمارے نقطۂ نظر سے مختلف نقطۂ نظر کی حامل

تھیں۔ قرآن کہتا ہے: ''تمہاری تخلیق اور حیات بعد الموت نفسِ واحد کی تخلیق اور حیات بعد الموت کی مانند ہے'' اس آیت میں شامل حیاتیاتی وحدت کی طرح کا ایک زندہ و جاوید تجربہ آج ایک ایسے منہاج کا تقاضا کرتا ہے جو عضویاتی طور پر کم ہیجانی ہو اور نفسیاتی لحاظ سے مادی قسم کے (ادراکات کے خوگر) ذہن کے لیے زیادہ موزوں ہو۔ اس نوع کے منہاج کی عدم موجودگی میں مذہبی علم کی سائنسی ہیت کا مطالبہ سراسر فطری امر ہے۔ ان خطبات میں جن کا مدراس مسلم ایسوسی ایشن کی درخواست پر بیڑہ اٹھایا گیا اور مدراس، حیدرآباد اور علی گڑھ میں دیئے گئے، میں نے کوشش کی ہے کہ اسلام کی فلسفیانہ روایات اور انسانی علم کے مختلف شعبوں میں حالیہ اضافوں کا ٹھیک ٹھیک لحاظ رکھتے ہوئے اس فوری تعمیل طلب مطالبے کو، گو جزوی طور پر ہی سہی، (تاہم) پورا کیا جائے اور یہ وقت اِس قسم کی مہم جوئی کے لیے انتہائی موزوں ہے۔ اعلیٰ درجے کی طبیعیات نے خود اپنی بنیادوں پر تنقیدی نظر سے بحث کرنا سیکھ لیا ہے۔ اس تنقید کے نتیجے میں مادیت کی وہ قسم جسے اس نے ابتداً ضروری قرار دیا تھا (اب) تیزی سے ناپید ہو رہی ہے اور وہ دن دور نہیں کہ جب مذہب اور سائنس اب تک گمان میں نہ آنے والی باہمی ہم آہنگیوں کو دریافت کر سکتے ہیں تاہم یہ بات لازماً یاد رکھنا ہو گی کہ فلسفیانہ تفکر میں کوئی شے ایسی نہیں ہے جسے حتمی حیثیت حاصل ہو۔ جیسے جیسے علم میں اضافہ ہو گا اور فکر کی نئی راہیں کھلیں گی تو ان (نقطہ ہائے نظر) کی نسبت جو ان خطبات میں پیش کیے گئے ہیں، دوسرے نقطہ ہائے نظر اور غالباً زیادہ مستحکم نقطہ ہائے نظر ممکن ہوں گے۔ ہمارا فرض ہے کہ انسانی فکر کی ترقی پر پوری توجہ سے نگاہ رکھیں اور اس کے حوالے سے ایک آزاد تنقیدی رویہ اپنائیں۔

ڈاکٹر عامر محمود
اسلام آباد، پاکستان

غالب اور غالبیات۔۔ایک تجزیاتی مطالعہ

انیسویں صدی عیسوی بلاشبہ اردو ادب میں غالبؔ کی صدی ہے۔ غالب نے فن اور فکر کے تمام اصولوں کو راہنما کرتے ہوئے شعرِ اُردو کی آب یاری کی اور اپنے لیے نہ صرف نئی طرح اور اسلوب ایجاد کیا بل کہ فنی لیاقت اور خیال کی ارفعیت سے اپنی تخلیقات کو حرف آخر کی صورت عطا کر دی۔ ذاتی، ادبی اور تخلیقی جواہر سے قطع نظر مرزا اسداللہ خاں غالبؔ اس حوالے سے بھی خوش قسمت رہے کہ انھیں اپنی زندگی میں ہی اہلِ سخن اور نقادانِ فن کی صورت میں نہ صرف پذیرائی نصیب ہوئی بل کہ لافانی شہرت ملی۔ اس لحاظ سے غالبؔ ہر دو اعتبار سے خوش قسمت رہے۔ خیال و اسلوب کی انفرادیت کی بدولت انھیں ادبی شہرت ملی اور نقادان فن کے ہاتھوں ادب اردو میں اولیت عطا ہوئی۔ اس پس منظری مطالعے سے یہ بات تو عیاں ہے کہ غالبؔ شناسی کے بنیادی زاویے ہمیں حیات غالبؔ سے ہی جڑے نظر آتے ہیں۔ غالبؔ کے انتقال کے بعد بھی آنے والے ہر دور نے ان کی شاعری اور نثر بل کہ مجموعی طور پر اُن کی ادبی قدو قامت کا اقرار کیا، اردو ادب میں غالب شناسی کی اس روایت میں جس کے رخشندہ ستارے امتیاز علی خاں عرشیؔ، مولانا غلام رسول مہر، مالک رام کی صورت میں نظر آتے ہیں عہد موجود میں جامعہ دہلی شعبہ اُردو کے پروفیسر آف ایمریطس، پروفیسر عبدالحق بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جن کی تدریس اُردو کے سلسلے میں تین دہائیوں کی خدمات ہی ان کا درست اور کامل تعارف ثابت ہوئیں کہ اس عرصہ میں انھوں نے اپنے ہاتھوں ایسے گوہر نایاب ادب اردو میں شامل کیے جن کی شہرت ان کی استادگی کی گواہ ہے۔ غالب اور غالبیات کے تعارف سے پہلے پروفیسر موصوف کی غالب اور کلام غالب سے انسیت کا ذکر ضروری ہے۔ اس رشتے کی ابتدا مصنف نے ''غالب اور غالبیات'' کے پہلے حصے میں عرض حال کے عنوان سے کچھ یوں ہے:

''غالب سے شغف تھا مگر اقبال کے عشق نے توجہ نا ہونے دی۔ ماہر القادری کی نعت گوئی پر ایک دقیق مضمون پڑھا جس میں غالبؔ کے حسب ذیل شعر کا حوالہ تھا۔

غالب ثنائے خواجہ بہ یزداں گزاشتم
کاں ذاتِ پاک مرتبہ دان محمدؐ است

اس شعر نے میرے احوال بدل دیے جب کبھی یہ شعر پڑھتا ہوں ایک اضطراب سے دو چار ہوتا ہوں اسی شعر نے غالب کے کلام کو پڑھنے پر مجبور کیا فارسی کے نعتیہ قصیدوں کو پڑھنے کے بعد غالبؔ سے مزید قربت کا احساس ہوا اور حسب ذیل شعر ذکر و فکر کے وظیفہ میں شامل ہوا:

فخر بشر امان رُسل قبلہ امم
کز شرع اوست قاعدۂ دانش استوار (۱)

غالب اور کلام غالبؔ سے محبت کے جو زاویے ہمیں اس شرح سے ملتے ہیں وہ عین شاہد ہیں کہ مصنف شعر و ادب سے لگاؤ اور فن کی نزاکتوں سے خیال کی عظمتوں تک کے سارے زاویوں سے آشنا ہیں۔ باوجود اس کے کلام غالبؔ کی فنی نزاکتوں اور عظمتوں کا ایک زمانہ معترف ہے شارحین غالبؔ نے غالب شناسی کی ثمر بار کاوشیں کی ہیں۔ غالبؔ جن کی شخصیت اور اہمیت کا جادو گزری صدی سے لمحہ موجود تک سر چڑھ کر بول رہا ہے۔ اپنے منفرد اور یکتا ہونے کا بھرپور احساس رکھتا ہے۔ جوش ملسیانی شرح دیوان غالب میں تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''مرزا غالب کی شاعرانہ شخصیت کسی تعریف و تعارف کی محتاج نہیں۔ ان کا پایہ سخن ہر قسم کی توصیف سے بالاتر ہے۔ ان کی جدت طراز طبیعت نے اردو کی نثر نگاری اور غزل گوئی میں وہ امتیازی شان پیدا کی کہ انھیں صحیح طور پر مجدد الوقت اور صاحب طرز کہا جا سکتا ہے۔'' (۲)

غالب کی شاعرانہ عظمت اور ادبی قد و قامت کا اعتراف ہر دور کے ناقدین نے کیا ہے اور ان کی فن کارانہ شخصیت کو بخوبی سراہا ہے۔ مرزا کی شخصیت، فن شعر و شاعری میں انفرادیت اور ادب میں اولیت کا اقرار ناصر دہلوی شرح دیوان غالبؔ کے دیباچہ میں ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''مرزا غالبؔ مرحوم دنیائے ادب کے وہ باکمال شاعر ہیں جن کا ثانی اُردو ادب میں آج تک پیدا نہیں ہوا۔ آئندہ کے متعلق سوائے اللہ تبارک و تعالیٰ کے کوئی نہیں جانتا لیکن کوئی بالفرض پیدا ہو بھی جائے تو ایسی شہرت و عزت یکدم حاصل نا کر سکے گا۔ مرزا غالبؔ کے تخیل کی بلندی تصور کی اطاعت، بلند پروازی، فصیح و بلیغ انشاء پردازی، پُرحکمت معنی آفرینی اور فلسفہ و تصوف کے گہرے رنگ اس دور کے شراب تغزل کو سرمدی شیشے میں ڈال کر میکدۂ غزل میں پیش کرے گا۔ اور یہ بقائے دوام جو مرزا غالبؔ کو حاصل ہو چکا ہے کیسے پیچھے چھوڑے گا۔'' (۳)

فکر وسخن کی محفل میں غالب کا قیام ومنصب دوسروں سے منفرد ہی نہیں بلکہ نمایاں اور بلند بھی ہے۔ غالب کے ہاں جزئیات نگاری بے پناہ رنگارنگی اور فراوانی کے ساتھ موجود ہے۔ جذبے کی صداقت کے ساتھ ساتھ طرز اظہار میں شوخی کی جھلک بھی موجود ہے۔ فوزیہ سحر ملک ترتیب غالب میں بیان کرتی ہیں:

''اس حقیقت سے کسی کو بھی انکار نہیں کہ غالب جہاں ایک بلند پایہ نثر نگار ہیں وہاں اس کی حیثیت شاعر کی بھی بہت بڑی ہے۔ اسلوب فکر ونگارش میں رنگارنگی کی جو فراوانی غالب کے ہاں موجود ہے اس کی مثال تو شائد ہی مل سکے۔ مکاتیب نگاری کی طرح شاعری میں بھی غالب کی انفرادیت و یکسانیت محتاج شرح وبیان نہیں ہے۔ غالب ایک بڑا صنائع ایک ذہین فنکار اور ایک حسن آفرین شاعر ہے۔ غالب ایک عندلیب گلشن نا آفریدہ تھا یہی وجہ ہے کہ غالب کی قدر مستقبل میں ہوئی۔''(۴)

غالب نے اردو شعر وادب کو اپنے ذوق تجسس اور ندرت فکر سے نیا پیراہن عطا کیا۔ غالب کی فکر خون جگر کی نمود ہے۔ غالب کی شاعری حقیقت نگاری اور صداقت بیانی کا حسین امتزاج ہے۔ مولانا غلام رسول مہر'' نوائے سروش'' کے مقدمہ میں بیان کرتے ہیں:

''غالب دراصل اردو شاعری کو جدید اسلوب پر لانے کا ذمہ دار تھا۔ اسے قدیم وجدید کے درمیان ایک برزخ کی حیثیت حاصل ہے۔ اس نے ندرت افروز فکر وبیان سے اردو زبان کو ایسا پرداز دے دیا۔ جس سے اس میں حسن اسالیب کے علاوہ دقیق حکیمانہ فلسفیانہ اور دوسرے نکات ومطالب بے تکلف پیش کرنے کی صلاحیت نمایاں ہوگئی۔''(۵)

شاعرانہ قدوقامت سے قطع نظر غالبؔ کی یہ بھی خوبی رہی کہ اسے شارحین کی صورت اچھے اور مستند نمائیندگان کلام ملے۔ جن کی صورت صف اوّل کی شروحات غالبؔ منظر عام پر آئیں اور شامل ادب اردو ہوئیں۔ انھیں میں سے ایک ''غالب اور غالبیات'' کی صورت زیر بحث ہے۔ زیر نظر کتاب نا صرف غالب شناسی کے نئے زاویوں کو متعارف کرواتی ہے بل کہ قدیم زاویوں پر پڑی گرد صاف کرتی ہے اور انھیں نئے رنگ وروپ عطا کرتی نظر آتی ہے۔ زیر نظر کتاب دس بنیادی ابواب اور تین ضمیمہ جات پر مشتمل ہے۔ کتاب کی ابتدا میں مصنف نے ''عرض حال'' کے عنوان سے اپنے ذاتی معاملات اور غالبؔ واقبال سے ذاتی انس ومحبت کو بخوبی بیان کیا ہے اور غالب شناسی کے حوالے سے طبیعت میں موجود ذوق واشتیاق کو باور کروایا ہے۔ کتاب کا پہلا باب اردو شاعری میں نقد ونظر کے تمام زاویوں کا رُخ بخوبی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے جس کا عنوان ''دیوان غالبؔ کا ایک اہم مخطوطہ'' ہے جو خاصا دقیق اور تحقیقی انداز میں دیوان غالبؔ کی ابتدا سے لمحہ موجود تک تدوین وتحقیق کی صورت کتابی صورت میں موجودگی پر بحث کرتا ہے۔ مشمولات میں غالبؔ کی زیر نگرانی ۱۸۲۱ء میں

اولین مطبوعہ سیدالاخبار دہلی کے دیوان سے لے کر ۱۹۲۱ء میں نسخہ بھوپال حمیدیہ لائبریری جسے مشیر تعلیم عبدالرحمن بجنوری نے پیش کیا اور اسی سال مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اُردو کی جانب سے شائع ہونے تک کی تفصیل خاصی مدلل اور محققانہ انداز میں پیش کی گئی ہے۔ علاوہ ازیں نسخہ بدایوں، نسخہ لاہور، نسخہ کراچی، نسخہ رام پور کے علاوہ ایک اور مخطوطہ کی تفصیل دی ہے جسے ڈاکٹر خواجہ معین الرحمان نے شائع کیا اور جس بابت ڈاکٹر تحسین فراقی اور خواجہ صاحب میں بحث ٹھن گئی تھی۔ بہرحال ایسے تمام واقعات اپنی وقتی ۔۔۔۔۔مخاصمتوں کے باوجود نئی جہات اور نئے زاویے آشکار ہونے کا سبب بنتے ہیں۔ فاضل مصنف نے غالب کے ایک ایسے قلمی نسخے کا ذکر صراحت کے ساتھ کیا ہے جس کے بارے اُن کا اندازہ ہے کہ یہ نسخہ مکمل اور محفوظ ہے۔ جس کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''دیوان غالبؔ کے قلمی نسخوں میں بس یہ ایک اضافہ ہے اور کسی نہ کسی حد تک اس کی اہمیت (معلوم شدہ) بھی ہے۔ دوسرا یہ کہ یہ غالبؔ کی زندگی کا ناسہی مگر یہ قریب ترین زمانے کا ہے۔ میرا قیاس ہے اور ممکن ہے کہ غالبؔ کی زندگی میں اس کی نقل و کتابت شروع ہوئی ہو اور خواہ کسی قلمی نسخہ یا کسی مطبوعہ نسخے کی مدد سے یہ تیار کیا گیا ہو۔ کیوں کہ غالبؔ کے انتقال کے تین ماہ بعد یہ مخطوطہ مکمل کیا گیا۔ ۱۸، فروری اور ۲۵ مئی کے دوران تین ماہ دس دن کا وقفہ ہے اور یہ نسخہ نواح دہلی کی یادگار ہے۔''(۶)

اس امر کی وضاحت مصنف نے کافی تردّد کے ساتھ تحقیقی انداز میں کی ہے اور باب کے اندر صرفی ونحوی حوالوں سے اس نسخہ کے استناد کی مثالیں پیش کی ہیں جو اردو ادب کی تحقیقی سرگرمیوں پر سوال اُٹھاتی ہیں اور محقق اردو کی توجہ اپنی جانب کھینچتی ہیں۔ دیوان غالبؔ سے اختلافی مثالیں تدوین اور تحقیق کے مسائل پر بحث کرتی یہ تحریر دیوان غالبؔ کے مختلف نسخوں کے مابین فرق پر عمل تدوین واصول تدوین پر سوالیہ نشان لگاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شعری صرفی ونحوی مثالیں عمل تحقیق اور تدوین کی راہیں ہموار کرتی ہیں۔ نسخہ حمیدیہ، نسخہ بھوپال ورام پور سمیت مختلف نسخوں میں شامل مشکوک، متروک، متداول کلام، متن میں اختلاف کی نوعیت سنجیدگی اور قطعی اختلاف کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس تدوینی اختلاف کے حل کی جانب فاضل مصنف کی یہ رائے بلاشبہ علمی وادبی حوالوں سے تو عمومی جب کہ تحقیقی وتدوینی حوالوں سے خصوصی اہمیت کی حامل ہے۔

''دیوان غالبؔ کو تدوین نو کی ضرورت ہے گو بزرگوں نے تدوین کی اچھی مثالیں قائم کیں اور عمر کا بڑا حصہ مطالعہ غالب میں صرف کر کے قابلِ قدر کام انجام دیئے۔ مگر ہر نئی تحقیق ماضی کی دریافت کو مسترد کرتی ہوئی آگے بڑھتی ہے۔ امتیاز علی خان عرشی، حمیداللہ خان، حامد علی خان جیسے مقتدر محققین کی بدولت غالبؔ کے کلام کو اعتبار حاصل ہوا تاہم اس پر قناعت کر لینا کافی نہیں بل کہ نظر ثانی کی ضرورت لازم ہے۔ یہ پون صدی پہلے کی کوششیں ہیں

جو مواد موجود تھا اس پر تدوین کی بنیاد رکھی گئی تحقیق و تدوین کے جدید تر اصول پیش نظر نا تھے ان سے جو بن پڑا بہتر طور پر سرانجام دیا کسی فرد سے تکمیلیت کی توقع تمنائے خام ہے۔''(۷)

کلام غالبؔ کے مختلف نسخوں اور تحقیقی و تنقیدی کاوشوں کا محققانہ اجمالی جائزہ فاضل مصنف کی غالبؔ شناسی کے تحقیقی و تنقیدی شعور کا عکاس ہے اور گزشتہ اور موجودہ دریافتوں اور ضروریات ادب خصوصاً غالبؔ شناسی کے عصری تقاضوں کی جانب درست راہنمائی کرتا ہے۔ اسی تسلسل کا ایک اور پہلو ''غالب کے شعری اسالیب پر موجود سیر حاصل بحث ہے جو دریا کو کوزے میں بند کرنے کے مترادف ہے۔ جس میں مرزا اسداللہ خان غالبؔ کے اسلوب آہنگ کا تشکیلی تعارف پیش کیا گیا ہے اور اس امر کا ادراک کروایا جاتا ہے کہ مرزا عربی و فارسی اسالیب ادب اور ان کے فنی و فکری زاویوں سے مکمل طور پر آگاہ تھے۔ گو غالبؔ شناسی کے حوالے سے شارح تفاسیر اور شروحات میں ان کے اسلوب نگارش کی درست صورتیں واضح کرنے کی کوششیں کی گئی ہیں۔ مگر لمحہ موجود تک کلام غالبؔ کی فنی جمالیات، فکری جمال آفرینی اس امر کی متقاضی ہے کہ ان پر مزید عرق ریزی کی جائے اور محسوسات غالب کی مکمل صورت واضح ہونے تک اس علمی و ادبی کار خیر کو جاری و ساری رکھا جائے۔ اس بات سے کس طرح اغماض کیا جا سکتا ہے کہ کلام غالب ایسا جام جہاں نما ہے جس میں عربی، فارسی، ریختہ و بین السطور شعری ادب کی فنی جمالیات اور فکری گیرائی و گہرائی غالب کے فن کارانہ پیرائے استادانہ اسلوب اور تخلیقانہ طرز نگارش کی بدولت بخوبی دیکھی جا سکتی ہیں۔ اُنھوں نے اپنے اسلوب کو مخصوص لب و لہجے فن کارانہ صناعی، تراکیب و تلمیحات اور علمی و ادبی مزاج دے کر ایک نئی طرز و ادا کا شاہ کار بنایا جس کی جانب پروفیسر عبدالحق یوں اشارہ کرتے ہیں:

''کلام غالبؔ حرف و صوت فکر و فن وغیرہ کی صناعی و سحر کاری کا ایک ایسا مرقع ہے جس میں ہر دور کے لیے بیش از پیش تصویریں آویزاں ہیں۔ ان میں شعری اسالیب کی متنوع مثالیں موجود ہیں۔ وہ ماضی کی روایات اور معاصر مذاق سخن کی موجودگی کے ساتھ مستقبل کی سخن وری کے لیے عالم ناز و ادا کی نشان دہی کرتے ہیں۔''(۸)

''پیامی شاعری'' کے عنوان سے موجود اگلا باب قاری پر غالب شناسی کے نئے در وا کرتا ہے جس میں اس پر محسوسات غالب کی صورتِ فن کی ابدیت و عالم گیریت کی دروں بینی حیرتوں کے پہار توڑتی ہے تا کہ وہ تخلیقات غالب کے سرسری مطالعے کے بجائے تاکیدی انداز میں ہر لفظ دامان خیال کے لیے دعوت نظارہ کے مصداق گنجینہ معانی کے توجہ طلب مئے خانوں سے گہرے لسانی و فکری مشاہدے کے ساتھ ساتھ شاعرانہ مزاج سے آشنا ہو سکے۔ یہ ایک ایسے شاعر بے بدل کا کلام ہے کہ جس میں زمینوں اور زمانوں کی قید و بند سے آزاد موضوعات کا تنوع تحقیقی فن کاریوں کے پیرہن اوڑھے خوب صورت لب و لہجے کے ساتھ خوشبوؤں کا نمائندہ

نظر آتا ہے۔ جو محض جذبات کا نعرۂ مستانہ نہیں بل کہ استدلالی طور کا خصوصی مزاج رکھتا ہے جس میں جرأت رندانہ کے امکانات بنیادی جب کہ جبر و استبداد کے خلاف گہرے فکری و فنی مزاج کے ساتھ اعلان جنگ موجود ہے ایسا طرز کلام جس میں بیان محض تمثیلی یا اشارتی نہیں بل کہ تبلیغ و تنبیہ کے ساتھ ساتھ جرأت و حوصلہ کے پیغام کو معاشرے کے قلب و جان میں تحلیل کرنے کی بے کراں خواہش بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ زندگی کے سہل و آسان راستوں سے ہٹ کر اس نابغے نے بقائے حیات کے ابدی تصورات کو ملحوظ خاطر رکھا اور ثبات و تغیر کے رویوں کی صورت کائنات کو کارگاہِ عمل کا استعارہ دیا۔ ان کی الہامی شاعری کا ایک اور دلچسپ پہلو ماضی پرستی سے گریز اور منفی موثرات سے دوری ہے گویا کہنہ روایت سے چشم پوشی غالبؔ کی سنجیدہ اور متین فکر کا ہی نتیجہ ہے۔ ان کے ہاں حسن و عشق کے معاملات، فنا و بقا کے موضوعات، مکاں و لامکاں، زمان و زمین جیسے مباحث عمیق مطالعے، ابہام و حجاب سے آزاد غالبؔ کی نکتہ آفرینی کے لبادے میں ممتاز اور منفرد نظر آتے ہیں ہم زیر مطالعہ کتاب سے اس صورت ایک دلچسپ استفسار پابند قلم کرتے ہیں:

''ناچیز کو غالبؔ کی پیامی شاعری پر اصرار ہے نا ادعائیت، مگر غالبؔ کو اپنے شعور کا شدید احساس تھا۔ انھیں حکیمانہ تصورات کو رہِ رواں شوق کے قافلے میں لٹا دینے کی آرزو بھی تھی۔ وہ ہزاروں خواہشوں اور تمناؤں کے ہجوم میں آنے والی ہلاکت کو سروکار کے لیے آفرین باد کہتے ہیں اس صورت مطالعہ غالبؔ کے کشتگان کی غیرت کہتی ہے کہ وہ صدف صلح کل، رندخرابات اور وسیع المشربی کے فن کار نہیں ہیں۔ ان کے فکر و پیام کی کارگہی کی اس قوت پر توجہ کی ضرورت ہے جو تقدیر بدل دینے کا عزم رکھتی ہے۔''(۹)

غالبؔ کا فارسی کلام اپنے ظاہر اور باطن میں فن و فکر کے گنجینہ ہائے گراں مایہ اپنے اندر سموئے ہے مگر اس امر سے بھی انکار ممکن نہیں کہ انھیں شہرت اُردو کلام سے ملی اور ان کا فارسی کلام محض تراجم و شروحات کی وجہ سے قارئین تک پہنچا۔ فاضل مصنف نے بھی مرزا کے فارسی کلام کی اہمیت اُجاگر کی ہے جس کی طرف ہمارے نقاد کی انتقادی نظر کبھی نہیں ٹھہری۔ وہ دونوں زبانوں کے شاعر تھے اور دونوں زبانوں میں خیال کا در آنا بھی یقینی تھا۔ کلام غالبؔ میں اُردو و فارسی کے ہم خیال اشعار کثرت سے ہیں جن کی موجودگی ان کے تخیل کی لسانی مماثلت کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس لسانی باشاعرانہ مماثلت کا اقرار پروفیسر عبدالحق یوں کرتے ہیں:

''گنجینہ معانی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

لفظ کو گنجینہ معنی کا طلسم قرار دے کر اُنھوں نے قاری، متن اور تنقید کی موجودہ گمرہی کی تمام ادعیت کی نفی کی ہے اسی اساسی خیال کو پیش نگاہ رکھیں تو فارسی کے اس مآخذ کی داد دے سکیں گے۔

در تہہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانہ
تا زدیوانم کتہ سرمستِ سخن خواہد شدن (۱۰)

یہ اور ایسے لاتعداد فکری زاویے ہیں جو افکار غالب میں اپنی تمام رعنائیوں اور بلندیوں کے ساتھ موجود ہیں۔ ان کے اشعار اور طرز سخن کے اعادے کے ساتھ ان کے صرفی ڈھانچے اور لسانی تشکیلات بقول مصنف اشتراک اور ارتباط کی مختلف صورتیں سخن شناسی کے لیے دامان خیال کو دعوت نظارہ دیتی ہیں۔

اس لفظی، لسانی یا موضوعاتی اعادے کے ساتھ غالبؔ کا ایک اور اُچھوتا زاویہ ان کی شاعری، شعری اسلوب کا استفہامیہ لہجہ ہے۔ اس استفہامیہ لب و لہجے کے ہاتھوں قاری استعجاب کی کیفیت کو محسوس کرتا ہے۔ غالبؔ کا استفہامیہ لب ولہجہ دراصل ان کے فلسفیانہ تفکرات اور شعور انسانی کی مختلف سطحوں کی دین ہے۔ ان کے اسلوب میں یہ پہلو خاصہ تہہ دار اور فطری ہے۔ جس کی وجہ ان کی جدت ندرت خیال اور فطری ارجمندی کسی روایتی تصور کی عملاً قبول نہیں کرتی اور وہ طرزِ نگارش کے عمومی راستوں سے ہٹ کر نئے زاویے تلاشتے ہیں اور یہ نئے زاویے ان کی میلانِ طبع، فکری پختگی اور فلسفیانہ مباحث کا پیرہن اوڑھ کر استفہامیہ انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ ان کے دیوان اردو کے اشعار اور بعض غزلیں مکمل طور پر استفہامیے کا درجہ رکھتی ہیں۔ مثلاً:

جب کہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے؟

اس لب ولہجہ اور طرزِ ادا کے حامل اشعار بجا طور پر اپنے اندر انفرادیت رکھتے ہیں اور موضوع و آہنگ کے اعتبار سے بھی معتبر اہمیت کے حامل ہیں۔ غالبؔ فن کی الہامی صورت اور اہمیت کے قائل تھے اس بنا پر انھوں نے اس کے کچھ قاعدے اور قوانین و اصول بھی وضع کیے۔ اس حوالے سے پروفیسر عبدالحق لکھتے ہیں:

''تمام نوع کے استفہام اسی نقطہ ادارک پر ٹھہر جاتے ہیں۔ غالبؔ فن و فکر کے تحیر کدے میں سراپا سوال بن کر اُبھرتے ہیں اور اپنے قاری کو استعجاب اور استفہام میں شامل کرتے ہیں اس عمل میں وہ ہماری حیرت و استعجاب میں اضافہ کرتے ہیں۔ یہ ان کے کلام کا ایک اہم عنصر ہے جو مفکرانہ نہ سہی مگر انا کی اخاذ طبیعت کی جولانی سے شرف یاب ہے اسے صرف شاعرانہ استفسار سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا۔ سینہ کائنات میں پوشیدہ و سربستہ راز کی تفہیم کے لیے وہ کوشاں تھے۔ ان کے شعور میں ایک فرزانگی فروزاں تھی۔ اس کا انھیں بھرپور ادراک تھا:

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کیا ہے بطرز استفہام (۱۱)

تفہیم غالب کے اگلے مرحلے پر آزادی کے بعد غالبؔ شناسی کے ہونے والے کام کا جائزہ ہے۔

غالبؔ اثر آفرین شاعر ہیں۔ ان کے اشعار نقش دوام کی صورت قلب واز بان پر ثبت ہوتے ہیں اور ایک سحر آ گیں کیفیت پیدا کرتے ہیں۔ غالبؔ کی ان موثرات کی مختلف جہتیں ہیں۔ ان کو مدنظر رکھتے ہوئے موجود شرحوں کا جائزہ اور ان کے پیش نظر مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ یہ کثرت اس امر کی غماض ہے کہ کلام غالبؔ کے احکافی تنوعات کا مطالعہ لازم کیا جائے۔

اگر ان شارحین پر ایک نظر ڈالیں تو سب سے اوّلین نقش حالیؔ کی صورت نظر آتا ہے۔ پھر علامہ اقبال اور علامہ بجنوری و شیخ اکرام کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ پاکستان میں ڈاکٹر سید معین الرحمن، ڈاکٹر محمد ایوب، ڈاکٹر محمد شکیل، ڈاکٹر فرخ ذبیح، ڈاکٹر نیلم ازہر اور ڈاکٹر محمد خان اشرف کے علاوہ پاک و ہند میں ڈاکٹر سید عارف شاہ گیلانی، ڈاکٹر سید خورشید الاسلام وارث کرمانی، عبدالصمی فاروقی اور ڈاکٹر زاہد شمیم قابلِ ذکر ہیں۔

ڈاکٹر موصوف اس حوالے سے لکھتے ہیں:

''غالبؔ کا اپنے کو ساساں ششم (یعنی دساتیری و مرآ باد عقدے کا آخری پیامبر لکھنا بہت اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر قاضی عبدالودود اور پروفیسر نذیر احمد نے بھی بہت اہم انکشافات کیے ہیں۔ جہانِ غالبؔ کا احاطہ ایک انسا کلیو پیڈیائی عمل ہے جس پر ابھی بہت کچھ لکھنا باقی ہے جس کی توقع میں کئی برس صرف ہو سکتے ہیں آنے والی نسلوں سے شاید ہماری یہ توقع شرمندہ تعبیر نا ہو سکے۔'' (۱۲)

اُردو شاعری کا عصری مطالعہ اس امر کی دلیل کا پُرزور جواز فراہم کرتا ہے کہ غالب بالاتفاق سب پر غالب ٹھہرے۔ اسلوب، خیال اور تاثیر سے ایک قدم آگے بوالہوس سے نشاط کشید کرنے کا فن فقط غالب ہی کا فنکارانہ اعجاز ہے۔ زیر مطالعہ موضوع نہ صرف پروفیسر عبدالحق کے استادانہ کمال بل کہ غالب شناسی کے حوالے سے اُن کے نقادانہ شعور کا عکاس ہے۔ اُنھوں نے مرزا غالب کے کلام کی تہہ در تہہ جہتوں کو جس صناعی سے آشکار کیا ہے، وہ یقینا قابلِ داد ہے۔ دیوانِ غالب کی تدوین، صحت کلام اور عصری تناظرات کے آئینے میں جن تدوینی اصولوں کو کلامِ غالب کی تدوین میں از سرنو لاگو کرنے کے متعلق جو سفارشات پیش کی ہیں وہ اُن کی ناقدانہ بصیرت اور متن شناسی سے آگاہی کی بین دلیل ہیں۔ ان سفارشات سے استفادہ کرتے ہوئے تدوینِ کلامِ غالب بالاشبہ اُردو زبان کے شعری سرمائے میں نئے جہانِ معانی کی دریافت کا پیش خیمہ ثابت ہوگی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔عبدالحق، پروفیسر: غالب اور غالبیات، کنگزوے کیمپ، دہلی، ۲۰۱۶ئ، ص: ۷۔۶

۲۔جوش ملسیانی: شرح دیوان غالب، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ئ، ص ۱۲

۳۔شرح دیوان غالب، ناصر دہلوی، علم و عرفان پبلشر، لاہور، ۲۰۰۷ئ، ص: ۹

۴۔فوزیہ سحر ملک: ترتیب غالب، تنقیدی و تحقیقی جائزے، ناز پبلی کیشنز، فیصل آباد، ۲۰۰۶ئ، ص ۲۸

۵۔غلام رسول مہر، مولانا: نوائے سروش، شیخ غلام علی اینڈ سنز، انارکلی، لاہور، س۔ن، ص ۱۶

۶۔عبدالحق، پروفیسر: غالب اور غالبیات، کنگزوے کیمپ، دہلی، ص: ۱۳

۷۔ایضاً۔ص: ۲۶

۸۔ایضاً۔ص: ۴۰

۹۔ایضاً۔ص: ۵۷۔۵۸

۱۰۔ایضاً۔ص: ۶۳

۱۱۔ایضاً۔ص: ۸۲

۱۲۔ایضاً۔ص: ۸۹

ڈاکٹر سرفراز جاوید
جامعہ نگر، دہلی

اقبال کا قصۂ آدم

علامہ کے فکر وفلسفہ کا خاص محور ابن آدم رہا ہے۔انہوں نے اپنے مطالعہ تجربہ اور مشاہدہ کی رو سے ذریاتِ آدم کی افہام وتفہیم پر بڑی توجہ صرف کی ہے۔ہم شریعت اسلامیہ کے حوالہ سے اس امر سے واقف ہیں۔کہ حضرت آدم اور ماں حوّا، بنی نوع انسان کے جد امجد ہیں۔خالق کائنات نے حضرت آدم علیہ السلام کو براہ راست اپنی مشیت کے مطابق تخلیق کیا۔بعد ازاں بابا آدم کی ہستی سے ماں حوا کو وجود بخشا۔تاہم خالق حق نے دونوں اوران کی ذریات کے ذریعہ نوع بشر کی تخلیق وفروغ کی سنت کا اجرا فرمایا، جو تا قیامت جاری رہے گا۔اللہ نے ہمارے جد امجد کو کرہ ارض پر جہالت وتاریکی کی حالت میں نہیں بھیجا تھا۔وہ تو قانون حیات کا کماحقہ علم رکھتے تھے۔انھوں نے اپنی ذریات کو علم کی روشنی سے آگاہ کیا۔مگر زمانی بعد کے ساتھ نوع بشر اپنی غفلت شعاری کا بار ہا مرتکب ہوتا رہا۔جس کے باعث نہ صرف حقیقی منہج اور علم سے دوری بلکہ نسیان کا شکار بھی ہوا ہے۔مزید بڑی غلطی یہ سرزد ہوئی کہ اس نے خیالی طور پر اپنے مادی خدا بھی پیدا کر لیے۔یعنی اس نے العلم کو بہت سے اوہام باطلہ اور ظنی نظریوں کی آمیزش سے مکدر کرلیا۔حیات ارضی میں رب کائنات کے تفویض کردہ عادلانہ اصول سے اعراض کر کے اپنی خواہشات نفس کے مطابق متعصّبانہ رسوم بھی قائم کرلیں۔جس سے خدائی زمین پر ابن آدم کے قصۂ خیر وشر کی رنگینیاں بڑھ گئیں۔

خالق حقیقی نے بنی نوع انسان پر یہ عظیم احسان کیا ہے۔کہ اس نے خاکی انسان کو توبہ واستغفار کے طفیل میں عفوودرگزر سے بھی نوازا ہے۔حتیٰ کہ خلیفۃ الارض اور جنت کا حقدار بھی بنایا ہے۔مزید مادی دنیا میں انسان کو جامع علم کا مکلف بنا کر بھیجا ہے۔کیونکہ قرآن حکیم میں انسانی وجود وتشکیل کا علم مذکور ہے۔جو ڈارونزم اور اس کے نظریہ سازوں کے قطعی برعکس ہے۔اللہ رب العزت نے ابن آدم کی تشکیل میں آغاز ہی سے قطعیت رکھی ہے۔کیونکہ ڈارون کے نظریہ کے مطابق انسان بہت سے ارتقائی مراحل طے کرنے کے بعد آدم کی اس ہیئت کو پہنچا ہے۔

اقبال اپنے کلام میں براہ راست جا بہ جا آدم سے مخاطب ہوئے ہیں۔ کیونکہ ابن آدم کی ہستی خاک بشر ہونے کے باوجود مخلوقات میں اشرف ہے۔ شاعر اسی لیے 'آفتاب صبح' نظم میں سورج سے مخاطب ہے کہ تو اپنے حسنِ عالم آرا سے ہی واقف نہیں، اسی باعث تو انسان کے ذرہ خاک کے برابر نہیں ہے:

اپنے حسنِ عالم آرا سے جو تو محرم نہیں ۔۔ ہمسر یک ذرہ خاک در آدم نہیں

اے بوالہوس انسان تیری حیات کا تو یہ مقصد نہیں، کہ تو صرف اس کا نظارہ کرے، مالک حقیقی نے تجھے یہ جو آنکھیں عطا کی ہیں ان کا مطمح نظر یہ ہے۔ کہ ان کے ذریعہ کائنات کی جملہ اشیا میں اپنے خالق کے جلوہ کا مشاہدہ کرے۔ 'تصویر درد' کے شعر پر توجہ کیجیے:

ترا نظارہ ہی اے بوالہوس مقصد نہیں اس کا بنایا ہے کسی نے کچھ سمجھ کر چشم آدم کو

نوع بشر کے مابین فرقہ پرستی ایک ایسا شجر ہے۔ جو ذریاتِ آدم کو باہم دشمنی کی تخم ریزی اور تعصب کے ثمر سے بار آور رکھتا ہے۔ حضرت آدمؑ اور ماں حوّا کو الجنہ کے اصل مقام سے نکلوا دیتا ہے:

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا ۔۔ یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

علامہ نے بڑی کم عمر میں 'سرگذشت آدم' نظم میں بنی نوع انسان کی روحانی اور مادی ارتقا کی مختصر تاریخ بیان کر دی ہے۔ اس تخلیقی فن پارہ میں انبیاؑ، حکماؑ، ملحدین اور انسانیت پرست لوگوں کے اخلاقی و مادی اشغال واعمال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ نظم کے ابتدائی اشعار میں عالم ارواح میں روحوں کے اپنے خالق کی بارگاہ میں اس اولین عہد و پیمان کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جس میں تمام ارواح نے اللہ کے اپنے رب ہونے کا اقرار کیا تھا۔ دیگر اشعار تلمیحی طرز کے باعث بڑی گہری معنویت کے حامل ہیں۔ جن میں حضراتِ ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور آنحضرتؐ کے اخلاق واعمال کی کارکردگی کی جانب توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ یہ حضراتؑ اپنے عہد کے باطل وطاغوت سے کس طرح نبرد آزما رہے۔ مگر اس معرکہ آرائی میں فضل ربی اور صبر واستقامت کے باعث فتح ونصرت سے سرفراز ہوئے۔ نظم میں دیگر مذاہب کے رہنماؤں کے لیے سرودِ ربانی یعنی اس ترکیب کے ذریعہ سری کرشن کی شخصیت، توحید ربانی سے افلاطون اور اہل ہند سے بت پرستی ترک کرنے، یعنی گوتم بدھ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مزید اس نظم میں خدا اور روح کا انکار کرنے والے دیم قراطیس، کلیسا اور سائنسدانوں کے تنازعات، اجرام فلک کے علم کے حوالہ سے گلیلیو اور نکولس کوپرنکس، کائنات میں کشش ثقل کے تعلق سے اسحاق نیوٹن اور ایکس رے کے لیے ڈرنگٹن کی طرف اشارہ کیا ہے۔ علامہ نے نظم کے آخری شعر میں واضح انداز میں یہ بات کہی ہے۔ کہ جب ابن آدم کی مظاہر پرست آنکھیں بصیرت افروز ہوئیں، تو معلوم ہوا کہ خود اپنا اور کائنات کا خالق و مالک میرے دل میں موجود ہے:

ہوئی جو چشم مظاہر پرست وا آخر　　تو پایا خانۂ دل میں اسے مکیں میں نے

مگر ہنوز دنیاوی حقیقت یہ ہے کہ خاکِ بشر مادی روپ سے تمام حیرت انگیز تحقیقی و علمی انکشافات کے باوجود، وہ اپنی ہستی کے راز سے آگاہی حاصل نہ کر سکا۔ علامہ نے جس کا اعتراف 'زمانہ حاضر کے انسان' کے اس شعر میں کیا ہے:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا　　زندگی کی شب تاریک سحر کر نہ سکا!

خالق کائنات نے بنی نوع انسان کو وجود بخشنے سے قبل اپنے عرش کے پائے پر ایک اکسیری نسخہ لکھا تھا۔ ملائکہ اسی نسخہ کو بنی آدم کی روح سے چھپانے کی کوشش کرتے تھے۔ کیونکہ افلاکی مخلوق زمینی کائنات کی حقیقت سے بے خبر تھی۔ 'محبت' نظم کا یہ شعر ملاحظہ کیجیے:

لکھا تھا عرش کے پائے پہ اک اکسیر کا نسخہ　　چھپاتے تھے فرشتے جس کو چشم روح آدم سے

دراصل علامہ کے فکر و خیال کی رو سے امت مسلمہ کا وجود دنیا میں بنی نوع انسان کی عریانیت و برائی کو ڈھانپنے کے لیے ہے۔ اگر یہ مٹ جائیں گے، تو نوع بشر کی رسوائی کا سبب بنے گیں۔ کیونکہ کرۂ ارض پر مسلم ہی احکام الٰہی کے پابند اور انسانی تہذیب و معاشرت کے پاسدار ہیں۔ 'مسلم' نظم کے اس شعر پر غور کیجیے:

میری ہستی پیرہن عریانی عالم کی ہے　　میرے مٹ جانے سے رسوائی بنی آدم کی ہے

انسانی فطرت میں یہ بات پائی جاتی ہے۔ کہ وہ اپنے عجز و انکسار کی شوخی میں خالق ازل سے بھی برہم و نالاں ہو جاتا ہے۔ جب کہ حکم ربی سے ملائکہ، خاک آدم کو سربسجود ہوئے تھے۔ جواب شکوہ:

اس قدر شوخ کہ اللہ سے بھی برہم ہے۔۔ تھا جو مسجودِ ملائک یہ وہی آدم ہے!

خالق آدم نے انسانی شخصیت میں تربیت یعنی تہذیب و شعور کا عام مادہ رکھا ہے۔ مگر کیا کیا جائے اس کے اندرون سے استقبالی جوہر گم ہو گیا، جو نوع بشر کے حقیقی طرز فکر کو قبول کرے:

تربیت عام تو ہے جوہر قابل ہی نہیں　　جس سے تعمیر ہو آدم کی وہ گل ہی نہیں

حقیقت میں اگر کوئی شخص حیات و زیست کی تمام احتیاجات خود اپنے قوت بازو سے پیدا کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ تو وہ دنیا میں سوائے رب کائنات کے کسی کا محتاج نہیں رہتا۔ نظام کائنات میں کرۂ ارض پر نوع بشر کی حیات اپنے آپ میں ضمیر کن فکاں کی مجاز ہے یعنی حدود شریعت میں دنیاوی اشیا کو مسخر کرنے کی حامل ہے۔ یہی حضرت آدم کی تخلیق کا راز ہے۔ اس راز کا عرفان حاصل کرنے والا ہی بقائے دوام کے استحقاق پر فائز ہوتے ہیں۔ خضر راہ کا یہ شعر اسی کا غماز ہے:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے　　سر آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی

علامہ کی فکر کے تعلق سے خاکی انسان کو دنیا کے اموری معاملات میں ماضی پرستی کی نرگسیت کو حاوی نہیں ہونے دینا چاہیے۔ بلکہ ماضی کے مثبت پہلوؤں کو مدنظر رکھتے ہوئے ،حال کے مقتضیات پر غور فکر کو اپنا شعار بنانا چاہیے۔ اسی سیاق میں ہم سب کو انسانی جذبۂ فکر سے وابستہ جملہ تعصّبات کی زنجیروں کو توڑ ڈالنا اچھا ہے۔ اور جنت سے دوری کے سبب کب تک ہماری آنکھیں اشک بار رہیں گی:

توڑ ڈالیں فطرت انساں نے زنجیریں تمام　　دوری جنت سے روتی چشم آدم کب تلک

اقبال خالق حقیقی سے جرأت آمیز لب لہجہ میں بطور استفسار درخواست گزار ہے۔ کہ اے میرے مولا اس کرۂ ارض کے ستارہ یعنی خاکِ بشر کے سبب کائنات میں چمک اور روشنی قائم ہے۔ اگر اس کا زوال ہوتا ہے تو اس میں میرا کوئی زیاں نہیں ہے تیرا ہی نقصان ہے اگر یہ خاکی نہ ہوگا تو یہ رونقیں بھی نہ ہوں گی۔ بال جبریل کی غزل کے شعر پر توجہ دیجیے:

اسی کوکب کی تابانی سے ہے تیرا جہاں روشن　　زوال آدم خاکی زیاں تیرا ہے یا میرا؟

ہم شریعت اسلامیہ کے سیاق میں اس بات سے بخوبی واقف ہیں۔ کہ اللہ رب العزت نے تخلیق کائنات میں تمام مخلوقات میں نوع انساں کو اشرف بنایا ہے۔ اس کی فطرت وسرشت میں شعور وتربیت کا مادہ بھی ودیعت کیا ہے۔ جس کے باعث مقام سربلندی وسرفرازی کے مراحل طے کر رہا ہے۔ تو فلک پر ستارے آدم کے اس ارتقائی عمل کے خوف سے سہمے ہوئے ہیں۔ کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ پھر سے بارگاہ خداوندی میں ،وہی کھویا ہوا شرف واعزاز حاصل کر کے ماہ کامل نہ بن جائے:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں　　کہ یہ ٹوٹا ہوا تارہ مہ کامل نہ بن جائے

اقبال خدا کی بارگا میں یہ گزارش کر رہا ہے کہ ہمارے خالق تیری مخلوقات میں یہ انسانی نقش بے معنی وباطل ہے، اسے بار بار پیدا کرنے سے کیا فائدہ ہے۔ یعنی ایک انسان یہاں سے معدوم ہوتا ہے اور دوسرا وجود میں آجاتا ہے۔ علامہ آدم کی اس ارزانی پر خدا سے استفسار کرتے ہیں:

ہو نقش اگر باطل، تکرار سے کیا حاصل　　کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی؟

دنیا میں بنی نوع انسان عرصۂ دراز سے ہنوز رنگ ونسل کے تعصّبات کا اسیر ہے۔ یعنی وہ نسلی برتری کے گمراہ کن طرز فکر کے بہت سے بت اپنی بغل میں چھپائے ہوئے ہے۔ علامہ افسوس ظاہر کرتے ہیں:

اسی طلسم کہن میں اسیر ہے آدم　　بغل میں اس کی ہیں اب تک بتان عہد عتیق

شاعر اپنے فکر وعلم کی رو سے قارئین کو یہ باور کرا رہا ہے کہ اگر خاک بشر کی طرز فکر میں حضرت عمرؓ جیسی مدبرانہ صفات اور حضرت علیؓ جیسی شجاعانہ خوبی ہوں۔ تو ایسے انسان دل بیدار شخصیت کے مالک ہوتے

ہیں۔ درحقیقت جسمِ آدم میں دل ودماغ کی بیداری انسان کو کیمیاوی صفات کا متحمل بنادیتی ہے۔یعنی ایسے شخص تانبے کوسونا بنانے کے مجاز ہوجاتے ہیں:

دل بیدار فاروقی، دل بیدار کراری مس آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

انسان کی شرف وعظمت سے کائنات کی تمام چیزیں واقف ہیں۔وہ جانتی ہیں کہ وہ اپنے مقام ومرتبہ کی انتہائی منزل پر کب پہنچ جائے۔اسی لیے افلاک، کہکشائیں اور ستارے سب خاک بشر کی سرفرازی کے منتظر ہیں:

عروج آدم خاکی کے منتظر ہیں تمام یہ کہکشاں، یہ ستارے، یہ نیلگوں افلاک

شاعر کا فکر تخیل دیکھیے، وہ یہ عرض کررہا ہے کہ ابن آدم نے لطیف مخلوق فرشتوں کو بھی انسانی سوز وتڑپ کی تعلیم دی ہے۔تاہم وہ آدم کو آداب خداوندی سکھارہا ہے۔یعنی نوع آدم کے دل میں اشرف المخلوقات ہونے کا جذبہ پیدا کررہا ہے:

سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ اس نے آدم کو سکھاتا ہے آداب خداوندی!

اقبال جرأت رندانہ کے باعث بڑے احترامی انداز میں خالق کائنات سے اس کی اشرف تخلیق یعنی خدائی شاہکار آدم کے تعلق سے عرض گزار ہے۔کہ اے مالک میں اس بے بصیرت انسان کا کیا ماجرا سناؤں جس کو تو نے بحر وبر کا سلطان بنایا ہے۔کہ اس کے اندر خود بینی ہے نہ خدابینی ہے۔کہ اس میں اوصاف حمیدہ کے بالمقابل خرابیاں زیادہ نظر آتی ہیں:

یہی آدم ہے سلطاں بحر وبر کا کہوں کیا ماجرا اس بے بصر کا

شاعر مشرق کی شاہکار نظموں میں مسجد قرطبہ خاص اہمیت کی حامل ہے۔جو عمارت کے تعلق سے عالمی زبان وادب میں لاثانی ہے۔جس کو خاکی انسان نے اپنے ہاتھوں سے تعمیر کیا ہے۔خالق کائنات کا یہ اشرف انسان جب نور ایمانی سے منور ہوجاتا ہے تو اس کی رسائی حقیقت میں عرش معلیٰ تک ہوجاتی ہے۔علامہ نے اس سیاق میں یہ تسلیم کیا ہے۔یوں تو انسان کی نگاہ نیلگوں آسمان ہی تک محدود ہے۔مگر ایمان ویقین کے نور سے اس کا سینہ تجلیات الٰہی کے باعث عرش معلیٰ کے مترادف ہوجاتا ہے۔یعنی اس پر خالق کائنات کے بہت سے راز واحکامات عیاں ہونے لگتے ہیں۔مسجد قرطبہ کا یہ شعر اسی طرف اشارہ کرتا ہے:

عرش معلیٰ سے کم سینۂ آدم نہیں گرچہ کف خاک کی حد ہے سپہر کبود

اقبال نے 'لینن خدا کے حضور' نظم میں بطور انسانی استغاثہ، لینن کی زبان سے خدا کی جناب میں عرض داشت پیش کی ہے۔کہ اے خالق حقیقی تو کس انسان کا معبود ہے؟ کیا اس خاکی انسان کا جو زیر آسمان حیات

وزیست کی تگدو کے لیے آباد ہوا ہے:

وہ کون سا آدم ہے کہ تو جس کا ہے معبود وہ آدم خاکی کہ جو ہے زیر سماوات؟

علامہ نوجوان نسل کی تعلیم وتربیت کے لیے بڑے متفکر رہتے تھے۔جس سے ان کی فطرت وسرشت میں وحدانیت وانسانیت کی تعلیم راسخ ہوجائے۔انھوں نے نئی نسل کو پیش نگاہ رکھ کر اپنے فرزند' جاوید کے نام' نظم میں ذریت اسلامیہ کے نوجوانان کو تلقین ونصیحت کے پیرایہ میں خطاب کیا ہے۔نئی نسل کو حتیٰ المقدور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔کہ نوع بشر کو دنیا میں عظیم مقصد لے کر بھیجا گیا ہے کہ وہ ہزارہا ترقیوں اور ہزار انواع کے وسائل وسامانِ سکون واطمینان مہیا کرنے کی کوشش ضرور کرتا ہے۔مگر کیا اچھا ہوتا کہ وہ احکم الحاکمین اور سنت رسولؐ کے عظیم مقصد کو مدنظر رکھ کر اس کی تحصیل کے لیے کوشاں رہتا ہے تو بلند مرتبہ کے ساتھ عظمت دائمی اس کی جز وتقدیر بن جاتی یعنی وہ صاحب مقصود ہوجاتا:

یہ ایک بات کہ آدم ہے صاحب مقصود ہزار گونہ فروغ وہزار گونہ فراغ!

یہ بدیہی حقیقت ہے کہ کرۂ ارض پر انسان کی بدولت جملہ رونقیں بروئے کار آئیں ہیں۔یعنی یہ عرض کر سکتے ہیں کائنات میں جو بھی مخلوقات کی سرگرمیاں ہیں اسی انسان کے لیے ہیں۔یعنی زمین وآسمان کی تمام چیزیں چاند سورج اور ستارے سب اسی آدم خاکی کے لیے تماشا بنے ہوئے ہیں۔'لالہ وصحرائی' نظم کا یہ شعر دیکھیے:

ہے گرمی آدم سے ہنگامۂ عالم گرم سورج بھی تماشائی، تارے بھی تماشائی

ساقی نامہ بال جبریل کی معروف نظموں میں شمار ہوتی ہے۔ابن آدم قدرت کے شاہکاروں میں یہ فوقیت رکھتا ہے۔کہ جس کے وجود میں ازل سے خودی اپنے آشکار کے لیے شعوری طور پر مضطرب وبے تاب ہے۔وہ اس کائنات کے وجود سے ہی خاک کے پتلے میں سمانے کے ساتھ ارتقائی راہ پر گامزن اور صورت پذیری کا مظہر بھی ہے:

ازل سے ہے یہ کشمکش میں اسیر ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

اقبال نے اپنے نظریۂ افکار کی دماغ سوزی میں کافی وقت رازِ آدم کے عرفان پر صرف کیا ہے۔وہ اس کی تفہیم کے لیے انتہائی کوشاں نظر آتے ہیں۔اتنا ہی نہیں وہ تو خاکی انسان کے ذرّے میں ایسی تابانی کے خواہاں ہیں کہ وہ مہر وماہ کے مرتبہ پر سرفراز ہوجائے:

سرِ آدم سے مجھے آگاہ کر خاک کے ذرے کو مہر وماہ کر!

اقبال مرید ہندی کی زبان سے عرض کرتا ہے۔کہ یہ خاک کا پتلا تیرے نور کے فیض سے چشم بصارت کی روشنی سے فیضیاب ہوا ہے۔وہ انسان کی اصل غایت کے جاننے کے بھی مشتاق ہیں۔انسانی عقل، حواس کی

اطلاعات سے کچھ نتیجہ ضرور اخذ کر لیتی ہے۔مگر وہ غیر یقینی صورت حال سے دوچار رہتی ہے۔انسان تو نظر و بینائی سے خدائی جلووں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہے۔جس سے یقین کی کیفیت دوچند ہو جاتی ہے:

خاک تیرے نور سے روشن بصر غایت آدم خبر ہے یا نظر؟

علامہ کی نظموں کے مطالعہ میں مکالماتی طرز کی نظمیں بھی ملتی ہیں۔جس میں 'جبریل و ابلیس' عمدہ نمونہ ہے۔ابلیس جبریلؑ سے مخاطب ہوتا ہے۔کہ اے جبریل اللہ کے دربار میں کبھی تجھے خلوت میسر آئے تو معلوم کیجیے گا، کہ بنی نوع انسان کی شخصیت میں یہ رنگینی کس طرح پیدا ہوئی۔دراصل وہ میرے ہی طفیل سے بروئے کار آئی ہے:

گر کبھی خلوت میسر ہو،تو پوچھ اللہ سے قصۂ آدم کو رنگین کر گیا کس کا لہو!

دنیا میں شریعتِ اسلامیہ کے پابند انسان اذان کی اہمیت سے خوب واقف ہیں۔کیونکہ اسلامی شعار میں اذان کے ذریعہ عوام الناس کو صلوٰۃ کے لیے متوجہ اور مجتمع کیا جاتا ہے۔فجر کی نماز صبح سویرے طلوع آفتاب سے قبل ادا کی جاتی ہے۔اس تعلق سے صبح کا تارہ آسمان کے دیگر ستاروں کو مخاطب کرتا ہے کہ آپ نے کبھی آدم کو بیدار بھی دیکھا ہے:

اک رات ستاروں سے کہا نجم سحر نے آدم کو بھی دیکھا ہے کسی نے کبھی بیدار؟

فانی دنیا میں بھی وہی شخص کامیاب ہے جس کی طبیعت میں بے نیازی کے ساتھ صبر و استغنا کا مادہ موجود ہوتا ہے۔کیونکہ اس کا مقصدِ حیات انسانیت کا فروغ اور وفلاح و بہبود ہوتا ہے۔اسی لیے فقر بادشاہی کی شان وشوکت کی رونمائی سے قدر بہتر ہے۔یعنی فقر آدم گری کا کام کرتا ہے۔بادشاہی مزاج صرف آئینہ سازی یعنی تصنع و بناوٹ کا کام ہے جو حقیقی وفطری نہیں ہے۔محبت نظم کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

مرا فقر بہتر ہے اسکندری سے یہ آدم گری ہے وہ آئینہ سازی

قرآنِ حکیم کی تعلیم کے مطابق شیطان ابلیس ابن آدم کا ازلی دشمن ہے۔وہ بنی نوع کی تخریب کا کوئی موقع ہاتھ سے خالی نہیں جانے دیتا۔وہ خالق کائنات کی جناب میں عرض گزار ہوتا ہے۔یہ مٹھی بھر خاک یعنی یہ انسان آگ کے شعلہ کا ٹکڑا بن گیا ہے۔کیونکہ یہ زمین پر فتنہ انگیزیاں برپا کرتا رہتا ہے۔'ابلیس کی عرض داشت' نظم کے اس شعر پر توجہ دیجیے:

کہتا تھا عزازیل خداوند جہاں سے پرکالہ،آتش ہوئی آدم کی کف خاک!

اقبال کا 'ضرب کلیم' مجموعہ پختہ عمر کلام ہے۔جس میں ان کا فکر وفلسفہ اپنی معراج پر ہے۔وہ باقاعدہ فکر وفلسفہ کے طالب علم رہے ہیں۔وہ اس کے مطالعہ کی عرق ریزی کے باعث اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ فلسفی کے

پاس ایسا کوئی نسخہ نہیں ہے۔جس سے نوع بشر کی حیات وزیست میں ثبات ودوام میسر آجائے۔شاعرؔ ایک فلسفہ زدہ سیدزادہ کے نام' نظم میں بنی نوع انسان کو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ انسان کو دستورالحیات میں ثبات کی طلب ہے۔یہ دونوں چیزیں احکام الٰہیہ اور سنت آنحضرتؐ میں مضمر ہیں۔کسی فلسفی کی تصنیف اس کی مجاز نہیں ہے۔اس لیے اس میں وقت ضائع کرنا لا حاصل ہے۔

آدم کو ثبات کی طلب ہے　　　　دستور حیات کی طلب ہے

علامہ کے نزدیک نوع بشر کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ اللہ تک رسائی حاصل کر لے،مگر تیری یعنی ملّا کی نگاہ سے آدمی کا مقام پوشیدہ نظر آتا ہے۔'ملائے حرم' کا یہ شعر:

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو　　　　تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام

ہم شرع کی رو سے یہ عرض کرتے ہیں کہ اگر کوئی شخص دنیاوی حیات وزیست کے تمام امور میں احکام الٰہی،اسوہ حضورؐ کو بروئے کار لائے تو اس کی شخصیت میں سایۂ خداوندی نظر آئے گا۔یہی مومن کی اصل کسوٹی بھی ہے۔اسی نقطہ پر وہ ظل سبحانی کے مقام پر فائز ہو جاتا ہے:

یہی مقام ہے مومن کی قوتوں کا عیار　　　　اسی مقام سے آدم ہے ظل سبحانی

جب ہم دنیا کے علمی امور میں انسانی تاریخ وسماجیات کا مطالعہ کرتے ہیں۔تو یہ متبادر ہوتا ہے۔کہ انسان کی ہستی ہزاروں سال سے معرض وجود میں ضرور ہے۔مگر زمانی اور نسلی بعد کے ساتھ غفلت کا شکار ہو کر خالق حقیقی کی عبودیت سے دوری کی مرتکب ہو جاتی ہے۔ہر زمانے کے مادی لات ومنات اپنے بہروپ کے فریبِ ظہور سے بنی نوع انسان کو اپنا شکار بناتے ہیں۔شیطان ابلیس نے انھیں مادی لات ومنات کے فریب ودجل سے اولادِ آدم کو ان کی احتیاجاتِ حیات کے سامنے مجبور محض بنا رکھا ہے۔یہی وجہ ہے کہ انسان شیطانی پروپیگنڈے کے سامنے سر بسجود بنا ہوا ہے۔اقبال انسان کو مذکورہ چیزوں کے بارے میں متوجہ کرتے ہیں۔مزید ابن آدم کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں۔کہ اگر ہم اپنے رب کی وحدانیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ہستی کے سامنے سجدہ ریز ہوتے رہے،تو ہزاروں لات ومنات کو سجدہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں رہے گی'نماز' نظم کے اشعار پر غور کیجیے:

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں　　　　اگر چہ پیر ہیں آدم، جواں ہیں لات ومنات
یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے　　　　ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات!

اقبال ابلیس کی یاسیت کا انکسارانہ انداز بارگاہ یزدی میں پیش کرتا ہے۔شیطان کہتا ہے اے خدا آدم سے مجھے کوئی بیر ودشمنی نہ تھی،جس کے باعث میں سجدے کا منکر ہوا۔کہ ہائے افسوس کہ ذریات آدم زمان

ومکان کی صعوبت میں گرفتار ہے۔ بھلا ایسے قیدی سے مجھے کیا حاصل کہ میں اس سے خدا واسطے کا بیر رکھوں:

اے خدائے کن فکاں! مجھ کو نہ تھا آدم سے بیر　　آہ! وہ زندانی نزدیک و دور و دیر زود

اولادِ آدم عقل و شعور حاصل کرنے کے بعد بھی ہنوز اپنی ہستی و نیستی کے طلسم میں گرفتار ہے۔ کیونکہ یہ انسان کا ایسا راز ہے۔ جس کی ہستی کو بیان کرنا خاک بشر کے لیے ممکن نہیں ہے اگرچہ زمانہ اپنے آغاز ہی سے مسلسل محوِ سفر ہے۔ اس کا یہ عمل بھی انسان کو فرسودگی سے ہم کنار نہ کر سکا۔ یہ خاکی انسان اپنے خیالات و افکار کی رو سے نت نئی جدت پیدا کرتا رہتا ہے۔ وہ ہنوز ویسا ہی تر و تازہ ہے۔ اقبال کہتے ہیں کہ تو اگر الجھن کا شکار نہ ہو تو یہ بتا دوں کہ انسانوں کا وجود اپنی اصل کے اعتبار سے روح اور بدن نہیں ہے:

طلسم بود و عدم، جس کا نام ہے آدم　　خدا کا راز ہے قادر نہیں ہے جس پہ سخن

اقبال نے عالمی سطح پر اپنے دور کے بنی نوانسان کے فکر و عمل پر غور کیا، تو ان کو یہ آشکار ہوا۔ کہ آج قوموں کے مابین میل ملاپ کی صورت و کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ تاہم انسانی وحدت کا تصور پردہ خفا میں ہے۔ اصل میں جمیعت اقوام کے بانی بھی نکتہ رس نہ ہو سکے۔ کیونکہ ان کا مقصد بنی نوع انسان کے درمیان قربت و وحدت قائم کرنا ہے، نہ کہ قوموں کو باہم ملانا، جب کہ مطالعہ و مشاہدہ یہ باور کراتا ہے۔ کہ اہل یوروپ کی جمیعت کا مقصد یہ ہے۔ کہ دیگر اقوام میں تفرقہ ڈال کر ان کو جداگانہ فکر کا حامل بنا دیا جائے۔ جس سے ان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑا جائے۔ جب کہ اسلام کی فکر ذریات آدم کو باہم متفق و متحد مزاج بنا کر انسانی ملت تشکیل دینے کی پاسبان ہے۔ یعنی بنی نوع انسان میں برادرانہ جذبہ بروئے کار لا کر عظیم مقصد کی تکمیل کی جائے۔ 'مکہ و جنیوا' نظم کے اشعار پر غور کیجیے:

اس دور میں اقوام کی صحبت بھی ہوئی عام ۔۔ پوشیدہ نگاہوں سے رہی وحدت آدم

تفریق ملل، حکمت افرنگ کا مقصود　　اسلام کا مقصود فقط ملت آدم

مکے نے دیا خاک جنیوا کو یہ پیغام　　جمیعت اقوام کہ جمیعت آدم!

اقبال اپنے مطالعہ مشاہدہ اور فکر کی رو سے اس نتیجہ کے متحمل ہوئے ہیں کہ انسان اپنی خودی کا عرفان حاصل نہ کرنے کے باعث ہنوز پردہ ہی میں پڑا ہوا ہے:

ابھی تک ہے پردے میں اولادِ آدم　　کسی کی خودی آشکارا نہیں ہے

علامہ کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ بنی آدم کی شخصیت میں ایسی جوہری تاثیر پیدا ہو جائے۔ کہ وہ خوف و ہراس اور غم سے آزادی حاصل کرے۔ مزید وہ انسان کی فکر کو غلامی سے حکمرانی کی طرف لے جانے کے خواہش مند ہیں۔ 'سرود حلال' نظم کا یہ شعر:

جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک　　اور پیدا ہوا یازی سے مقام محمود

شاعر دنیاوی فن کار اور ہنر مند حضرات کی اس طرز فکر سے بیزاری کا اظہار کرتا ہے۔ کیونکہ وہ ابن آدم کی بصارت و بصیرت سے مقامات بلند کو چھپاتے ہیں۔ وہ انسانوں کی روح کو خوابیدہ بنا کر ان کے جسم میں حرکت و بیداری ضرور لا دیتے ہیں۔ مگر ان کی فکر کو روحانیت سے دور کر دیتے ہیں۔ مزید ان کے جوش و جذبہ میں ہیجان کی سی کیفیت دو چند کر دیتے ہیں۔ 'ہنروان ہند' کا شعر ملاحظہ کیجیے:

چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند　　کرتے ہیں روح کو خوابیدہ، بدن کو بیدار

اقبال نے انسانوں کے باہم تفرقہ بازی کے رویہ سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے۔ کہ کل ماضی میں ایک قوم نے دوسری قوم کو لوٹنے اور قتل و غارت گری روا رکھی تھی۔ آج ہمیں موقع ملا ہے تو ہم بھی اسی کام کو انجام دے رہے ہیں۔ تو پھر آپ کیوں چیں بہ چیں ہو رہے ہو، اگر یہ عمل آپ اپنے لیے جائز سمجھتے تھے تو آج ہمارے لیے بھی درست تسلیم کریں۔ 'مسولینی' نظم میں یہ شعر:

پردۂ تہذیب میں غارت گری، آدم کشی　　کل روا رکھی تھی تم نے، میں روا رکھتا ہوں آج

اقبال یہ بیان کرتے ہیں کہ اے ابن آدم تیرا باطن و ضمیر اس حقیقت پر گواہ ہے کہ درویشی اور فقیری کا علم بہت ہی سہل و آسان ہے۔ جس پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ غزل کا یہ شعر:

آدم کا ضمیر اس کی حقیقت پہ ہے شاہد　　مشکل نہیں اے سالک رہ! علم فقیری

اقبال کا آخری مجموعہ کلام 'ارمغانِ حجاز' ہے۔ جس میں ایک نظم 'ابلیس کی مجلسِ شوریٰ' کے عنوان سے ہے۔ انھوں نے اس میں آدم کے ازلی دشمن شیطان کے مکر و فریب کے فکری رویہ کو مکالماتی انداز میں پیش کیا ہے۔ کہ ابلیس نے بڑی چابک دستی سے دنیا میں انسان کو کس قدر سیاسی و سماجی امور میں، جمہوریت کے خوش پوش لباس کی خوش فہمی میں مبتلا کر رکھا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ بادشاہت کو ہم نے اس لیے جمہوریت میں منتقل کیا ہے۔ کہ آدم کے باطن و شعور میں بیداری کا احساس پیدا ہو رہا تھا۔ پہلے مشیر کے مکالمہ پر غور فرمائیے:

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس　　جب ذرا آدم ہوا خود شناس و خود نگر

عوام کی سادہ لوحی کے تعلق سے ابلیس کا پانچواں مشیر اس قدر مطمئن ہے۔ کہ وہ بھلی بھانتی یہ سمجھتا ہے۔ کہ یہ عوام جس ہستی کو خدا کہتی ہے۔ کہ وہ بھی انسان کی فطرت سے اتنا آگاہ نہیں ہے۔ جتنا وہ اس کو سمجھتا ہے:

تجھ سے بڑھ کر فطرت آدم کا وہ محرم نہیں　　سادہ دل بندوں میں جو مشہور ہے پروردگار

حقیقت یہ ہے کہ باطل خداؤں کی پرستش کے باعث، خود خدائی صفات کا حامل انسان بھی ذلیل و خوار

ہو گیا ہے۔اس جہاں کا انسان حق وحکمت سے عاری ہو کر قلب ونظر پر بوجھ بن گیا ہے۔'عالم برزخ' نظم کا یہ شعر دیکھیے:

خوار ہو کر کس قدر آدم یزداں صفات　　قلب ونظر پر گراں ایسے جہاں کا ثبات

قران وحکمت کی رو سے کائنات کی جملہ چیزیں نوع آدم کو دعوت دیدار دیتی ہیں۔ان پر غور وفکر کرنے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ ان سب کے اندر بہت سی صفات پوشیدگی میں ہے مگر ان میں ذوق نمائش کا جذبہ موجود ہے۔'حضرت انساں' نظم کے شعر پر توجہ دیجیے:

یہ دنیا دعوت دیدار ہے فرزند آدم کو　　کہ ہر مستور کو بخشا گیا ہے ذوق عریانی

حضرت انسان کا وجود دنیاوی امور میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔خدا کی مشیت جو دریاؤں میں طوفان لاتی ہے۔دراصل یہ انسان کے خونی آنسو ہوتے ہیں علامہ کہتے ہیں:

یہی فرزند آدم ہے کہ جس کے اشک خونیں سے　　کیا ہے حضرت یزداں نے دریاؤں کو طوفانی

راقم نے اس مضمون میں کلام اقبال کے بیشتر ان اردو اشعار کو موضوع بحث بنایا ہے۔جن میں آدم لفظ کی تکرار موجود ہے۔ورنہ کلام اقبال کے فکر وفلسفہ کا محور ہی ابن آدم کی ذات ہے۔دراصل اقبال کے فکری فلسفہ کی اساس شریعت اسلامیہ سے ماخوذ ہے۔وہ بنی نوع آدم کی دونوں جہاں کی کامیابی اسوہ محمد ﷺ میں دیکھتے ہیں۔کیونکہ علامہ ایک ایسے شاعر ہیں جو کائنات کی تمام شئ میں نہ صرف خود غور فکر کی سعی کرتے ہیں بلکہ دوسرے لوگوں میں بھی تحریک وجستجو کا مادہ بیدار کرتے ہیں۔اقبال کے قصۂ آدم کے تعلق سے یہ بہت ہی معمولی سی کوشش ہے۔ورنہ پورا کلام فکر کے اعتبار سے قصۂ آدم ہی کا اظہار ہے۔

اقبال اکیڈمی کی مطبوعات

خود آگہی : ڈاکٹر سید ظفر محمود کے فکر انگیز مضامین کا بے مثل مجموعہ۔ قیمت:-/400

جلوۂ دانشِ فرنگ : پروفیسر عبدالرحیم قدوائی کا علامہ اقبال پر مغربی مفکرین کے رقم کردہ خیال افروز مقالات کا دل کش اردو ترجمہ۔ قیمت:-/300

اقبال کی فکری سرگزشت : پروفیسر عبدالحق قیمت:-/300

سوز و گدازِ زندگی : پروفیسر عبدالحق قیمت:-/500

اربابِ نظر : پروفیسر عبدالحق قیمت:-/300

معروضات و مطالعہ : پروفیسر عبدالحق قیمت:-/300

علامہ اقبال اور دوسرے علمی و ادبی موضوعات پر پروفیسر عبدالحق کے علمی مقالات اور تاثرات کے فکر انگیز مجموعے۔